تہذیبِ اسلامی

یعنی

محمد مارمیڈیوک پکتھال کے

خطباتِ مدراس کا اُردو ترجمہ

مترجمہ

شیخ عطاء اللہ ایم۔ اے

پرنسپل

اسلامیہ کالج چنیوٹ

ناشر

شیخ محمد اشرف۔ تاجر کتب کشمیری بازار

لاہور

اشاعت اول

مارچ ۵۵ء

اشرف پریس لاہور میں باہتمام شیخ محمد اشرف پرنٹر

مندرجات

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

عرض مترجم

محمد مارماڈیوک پکتھال کے والد گرامی ریورنڈ سی۔ جی پکتھال چلسفورڈ کے ریکٹر تھے۔ والدہ مُیری امیرالبحر ڈی۔ ایچ او برائین کی بیٹی تھیں۔ ابتدائی تعلیم ہیرو میں حاصل کی۔ یورپ میں فرنچ۔ جرمن۔ اطالوی اور ہسپانوی زبانیں سیکھیں۔ ٹرکی میں عربی اور ترکی زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ ایّام جوانی میں انھیں بالخصوص ٹرکی۔ شام اور مصر کی سیاحت۔ اُن میں طویل قیام اور مسلمانوں سے گہرے تعلقات پیدا کرنے کے متعدد مواقع میسّر آئے۔ اس طویل صحبت کی بنا پر مسلمانوں سے انھیں ایک دلی لگاؤ اور ایک تعلق خاطر پیدا ہو گیا۔

مسلمانوں کی ہم نشینی اور دوستی نے اُن میں اسلام سے دلچسپی پیدا کی۔ عربی خوب جانتے تھے۔ قرآنِ کریم کا مطالعہ فرمایا اور ۱۹۱۹ء میں لندن میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسلامی معلومات کا یہ عالم تھا کہ اعلانِ اسلام کے ساتھ ہی جامع ووکنگ میں امامت اور خطبہ جمعہ کے فرائض کچھ عرصے کے لئے اُن سے متعلق ہوئے۔ اعلان سے قبل بھی وہ اُن معدودے چند انگریزوں میں سے تھے جو عالمگیر جنگِ اوّل کے اختتام پر ترکوں سے منصفانہ صلح کے لئے کوشاں رہے۔
تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے میں ہندوستان پہنچے بمبئی کے مشہور قومی اخبار بمبئے کرانیکل کے فرائض ادارت ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۴ء تک انجام دیتے رہے اور اس طرح اپنی تمام صلاحیتوں کو ہندوستان میں قومی خدمت کے وقف کئے رکھا۔ بمبئی سے حیدرآباد پہنچے - چادرگھاٹ ہائی سکول کی پرنسپلی قبول فرمالی اور عدیم المثال محبت و شفقت کے ساتھ طلبأ کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہے۔ نادار طلبأ کی خود مالی امداد کرتے رہے۔ مجھے علی گڑھ میں اُن کے چند شاگردوں سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ اُن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ لیکن ہر ایک اُن کے خلوص اور اُن کی شفقتِ پدرانہ کا مداح تھا۔

قیامِ حیدرآباد میں انھوں نے "اسلامک کلچر" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا اور دیکھتے دیکھتے اُسے اوّل درجہ کے جرائد کی صف میں

لا کھڑا کیا۔ اس کے پڑھنے اور اُس کے لئے لکھنے والوں کا وسیع حلقہ ایشیا۔ یورپ۔ افریقہ اور امریکہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ وہ پہلے نومسلم انگریز تھے جنھیں یہ توفیق وسعادت میسر آئی۔ اور آج اُن کا ترجمہ امریکی طباعت کی بدولت انگریزی داں دُنیا میں عدیم المثال اشاعت وقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ انھوں نے حسب ذیل انگریزی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔

'سعید ماہی گیر'۔ 'سلاطین کی دادی'۔ 'برقعہ پوش عورتیں'۔
'دارالسلام'۔ 'دارالحرب'۔ 'مشرقی محاربات'۔ 'عربی جانباز'۔
'الفجر'۔ 'قصص بیت المقدس'۔ وغیرہ

حیدرآباد سے سبکدوش ہوئے تو انگلستان میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے ایک سوسائٹی قائم کی۔ انگلستان میں ہی مئی ۱۹۳۶ء میں جنت کو سدھارے۔

مدراس میں ایک زمانے میں ایک اسلامی انجمن تھی جو مشہور علماء وفضلا اسلامی کے لئے ارشاد ودعوت کے مواقع بہم پہنچایا کرتی تھی۔ اقبال کے 'فکر اسلامی کی تشکیل نو' اور سید سلیمان ندوی مرحوم کے 'نقوش سلیمانی' اسی انجمن کے زیرِ اہتمام دیئے گئے خطبات کے مجموعے ہیں۔ محمد مارمے ڈیوک پکتھال نے بھی اسی انجمن کے زیرِ اہتمام آٹھ لیکچر دیئے تھے جو کلچرل

سائیڈ آف اسلام' کے نام سے شائع ہوئے۔

یہ کتاب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہنار و طلبا کے لئے داخلِ نصاب تھی میں نے اسے ۱۹۳۱ء میں دیکھا اور خواہش پیدا ہوئی کہ اس کا اُردو ترجمہ شائع کیا جائے تاکہ مسلمان نوجوان اُس سے ہدایت یاب ہوں اور ہمارے علمأ دیکھ سکیں کہ ایک جہاندیدہ اور فرزانہ نومسلم انگریز اسلام اور دُنیا میں اُس کے منصب اور مقام کو کس نظر سے دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ ترجمے کی اجازت چاہی جو بخوشی مرحمت ہوئی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ اُس سے پیشتر خواجہ غلام السیدین پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایسی ہی اجازت حاصل کر چکے ہیں اُن سے دریافت حال پر معلوم ہوا کہ اُن کا مسودہ ترجمہ، جامعہ ملیہ دہلی کے پریس میں کہیں لاپتہ ہو چکا ہے اور وہ دوبارہ اس محنت کے متحمل نہیں ہوں گے، انھوں نے اس کوشش کو بخوشی مجھ پر چھوڑ دیا۔

۱۹۳۷ء میں اوّل مرتبہ علی گڑھ میں کتاب پریس میں گئی چھ ماہ میں صرف ۲۰۸ صفحات طبع ہو سکے اور مطبع کے ہر قسم کے کارکن انتخابات کے سلسلہ میں نفع اندوزی کے لئے آگرہ بھاگ گئے۔ وقت نکلتا گیا ۱۹۴۰ء میں دوبارہ کتاب کی اشاعت کے لئے کوشش کی لیکن عالمگیر جنگ دوم کے برپا کئے ہوئے گوناگوں موانع درپیش تھے۔ ناچار خاموش رہا۔ جنگ

ختم ہوئی تو ہندوستان ایک داخلی سیاسی خلفشار میں مبتلا تھا۔ رفتہ رفتہ فسادات شروع ہوئے تا آنکہ اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان دو حصوں میں بٹ کر آزاد ہو گیا۔ میں اپنے ضروری کاغذات بغل میں دابے جون ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ سے لاہور پہنچا۔ اس عرصے میں میں نے اجازت اشاعتِ ترجمہ کی تجدید کرالی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں میرے حبیب قدیم اور لاہور اور علی گڑھ کے رفیقِ گرامی خان عنایت علی خان نے علی گڑھ کی یاد میں لاہور سے ہفتہ وار "علیگ" شائع کیا۔ انھیں خطباتِ پکتھال کے اُردو ترجمے کا علم تھا۔ وہ خطبات کی پہلے علیگ میں بہ اقساط اور بعد میں کتاب کی صورت میں اشاعت پر مصر ہوئے۔ چنانچہ تین خطبات علیگ میں شائع ہوئے۔ میرے پاس کتاب کے آخری تین خطبات کاتب کے لکھے ہوئے ایک لفافے میں بند پڑے تھے۔ کم از کم میں یہی سمجھتا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں جو اُس لفافے کو کھولا تو یہ دیکھ کر بے حد صدمہ ہوا کہ خطباتِ پکتھال کی جگہ "خانہ داری" پر ایک کتاب کا کاتب کا لکھا ہوا مسودہ موجود ہے۔ کتاب کے آخری تین ابواب کا ترجمہ کہ نصف کتاب ہے یا علی گڑھ میں رہ گیا یا دلی میں ایک دوست کے ہاں۔ اس ضیاع کا قلق میرے دل و دماغ سے نکل کر میری روح میں پیوست ہو گیا لیکن اس شدّتِ احساس کے باوجود میں اس محنتِ برباد رفتہ کی تلافی کے لئے اپنے آپ کو دوبارہ آمادہ نہ پاتا تھا۔

اس عرصے میں علیگ' کاغذ کی کمیابی کی نذر ہو گیا اور عنایت علی خان صاحب کا تقاضا تکمیل ترجمہ قدرتاً ختم ہو گیا۔ اسی دوران میں عزیزی تسلیم کو کہ ہیلی کالج میں میرے صاحب ذوق اور سعادت مند نوجوان رفیق کار تھے، اس سلسلہ میں میری شکستہ دلی و مایوسی کا علم ہوا تو انھوں نے نصف کتاب کے دوبارہ ترجمہ کی تکمیل کی پُرزور اور مسلسل فرمائش سے میرے عزم شکستہ کو آمادگی مکرر میں بدل دیا اور اس طرح کتاب دوبارہ ۱۹۵۲ء میں مکمل ہو گئی۔

آج دیکھتا ہوں کہ اس چھوٹی سی کوشش کو شروع کئے کم و بیش ایک چوتھائی صدی گذر چکی ہے۔ وہ جو فرمایا گیا ہے کہ ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر و مقدر ہوتا ہے۔ اپنی زندگی میں اس کتاب کی اشاعت کو اس ارشاد کی صداقت کی بہترین مثال سمجھتا ہوں۔ تاہم اس قدر طویل مدت کے بعد بھی اس کتاب کی اشاعت پر ایک بے پایاں روحانی، قلبی و ذہنی طمانیت و مسرت محسوس کرتا ہوں اور اسے محض فضل ایزدی سمجھتا ہوں کہ اس کی اشاعت کی نوبت آگئی۔ کیا تعجب ہے کہ یہ ناچیز کوشش ہی میرے نامۂ اعمال میں سب سے بڑی سعادت شمار ہو۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا مطالعہ نوجوانوں کے لئے اسلام دوستی اور اعمال صالح کا محرک ثابت ہوگا۔ لیکن مجھے اس طویل محنت انتظار کا ایک حد درجہ شیریں اور

خوشگوار اجر مبسّر آیا ہے مشیّت ایزدی کو معلوم ہوتا ہے یہی انتظار تھا کہ ہندوستان آزاد ہو، پاکستان کے حسین وجمیل نام سے ایک اسلامی سلطنت نقشۂ عالم پر جلوہ گر ہو لے تو یہ کتاب پاکستان کے علمی۔ ذہنی اور قلبی مرکز لاہور سے کتب اسلامیہ کے مشہور ناشر شیخ **محمد اشرف** صاحب کے اہتمام سے اشاعت پذیر ہو۔

چھپ چکنے پر بھی کتاب کو ایک سال سے زائد مدّت کے لئے دنیائے اسلام کے ایک مشہور ومعروف عالم کے پیش لفظ کا انتظار رہا لیکن اب اُس کی حسرت باقی اور اُمید ختم ہو چکی ہے۔

قیامِ پاکستان نے ایک بانگِ درا کا کام دیا ہے۔ اور کاروانِ اسلام دوبارہ جادہ پیما ہو چکا ہے۔ ہر طرف غلامی سے بیزاری۔ آزادی کے لئے ایک ولولہ اور اسلام کی طرف لوٹ آنے کے لئے ایک بیتابی پائی جاتی ہے اصلاحِ حال کی یہ کوشش ساحلِ نیل سے خاکِ کاشغر تک اور انڈونیشیا سے مراکش تک بارور ہو رہی ہے۔ ان ملکی اور قومی کوششوں کے ساتھ ساتھ بیک وقت اتحادِ عالمِ اسلام کی ضرورت ومصلحت کا اعتراف ہے مسلمان ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ موانع درپیش ہیں اور صبر آزما لیکن مسلمان ثابت قدم ہے اور ہر کہیں پورے یقین کے ساتھ

باش تا بینی بہارے دیگرے　　　از بہارِ پاستاں رنگیں ترے

کا منتظر ہے۔

یہ ناچیز کوشش صاحبِ خطبات کے جذبات کے احترام و مطابقت میں ملّتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے اور صاحبِ خطبات نے عالمِ اسلام کے استحکام و استقلال اور خوش حالی کے لئے جو تدابیر پیش کیں ہیں انھیں اقبالؔ کی زبان میں اس تقدیم میں ظاہر کیا گیا ہے اسلام اور اتحاد عالمِ اسلام وقت کی اور عالمِ انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت ہے خدا کرے جوانوں کی سرفروشیاں اور پیروں کی پختہ کاریاں عالمِ اسلام کو گردابِ بلا سے نکال کر جلد ساحلِ مراد تک پہنچا دیں۔ مسلمان کا دامن دولتِ عمل سے مالامال ہوجائے۔ اور عالمِ اسلام کو پھر ایک بار اس کی کھوئی ہوئی عظمت نصیب ہو۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

کتابت و طباعت اور انتظار پیش لفظ میں دو برس کی طویل مدت گزر گئی۔ دنیا اس عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچی۔ مَیں لاہور سے چنیوٹ آ گیا۔ تاہم جائے شکایت نہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ ایک مدت العمر کی آرزو پوری ہوئی اور ایک خدمت چوتھائی صدی گزر جانے پر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

عطاءاللہ

اسلامیہ کالج چنیوٹ

یکم مارچ ۱۹۵۵ء

ہے۔ رہنما اور ہادی تو خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ہدایت کا سرچشمہ قرآنِ کریم اور مقصود خود ذاتِ باری ہے۔

تہذیبِ اسلامی سے میری مراد ایسی تہذیب نہیں جو کسی مسلم قوم کو کسی خارجی ماخذ سے حاصل ہوئی ہو بلکہ تہذیبِ اسلامی سے مراد اسلام یعنی اُس مذہب کی معین کردہ تہذیب ہے جس کا کھلا ہوا مقصد انسانی ترقی ہے۔

ہر وہ شخص جسے قرآنِ کریم کے مطالعہ کی سعادت نصیب ہوئی ہے تسلیم کرے گا کہ قرآنِ کریم اُن لوگوں کے لئے جو اُس کی تعلیمات پر عامل ہوں اس دُنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا وعدہ کرتا ہے نیز یہ کہ قرآنِ کریم کے پیشِ نظر بنی نوع انسان کی فلاح و کامرانی ہے جو قوائے انسانی کی بالیدگی اور عطیاتِ الٰہی کی آراستگی سے نصیب ہوسکتی ہے۔ اگر مسلمانوں نے کوئی ایسا طریقِ زندگی یا طرزِ عمل اختیار کر لیا ہے جو تعلیماتِ قرآنی یا صریح احکامِ نبویؐ پر مبنی نہیں ہے تو وہ ایک غیر اسلامی طریق ہے جس کا سُراغ نظامِ اسلامی کے باہر ملے گا۔ مسلمانوں کو کوئی غیر شرعی نظام قبول کر کے خواہ وہ بظاہر اُن کی ترقی کے راستے میں حارج نظر نہ آتا ہو فلاح و کامیابی کی اُمید نہ رکھنی چاہیئے۔ سہرنیا

آئین جو تعلیماتِ قرآنی کے صریح منافی اور ہادیٔ برحق کی تعلیم و عمل کے مخالف ہوگا مسلمان پر کامیابی کی راہیں مسدود کر دیگا مسلمان کے لئے کسی غیر اسلامی آئین کا اختیار کرنا اپنے آپ کو ورطہ ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

اسلام نے ابتدا میں فنون کی چند صورتوں کو زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی اُن سے بت پرستانہ مناسبت اور اُن کی سیاہ کارانہ بدمستیوں کی یاد کی بنا پر مخالفت کی کیونکہ قوم کی ترقی کے لئے ایسی یادگاروں کا نابود کر دینا ضروری تھا۔ لیکن بعض فنون کی مخالفت اور بعض کی موافقت ان فنون کے نمونوں کی طرح محض ایک ضمنی چیز تھی۔

تہذیب اسلامی کا منشا زندگی کے غیر ضروری اور رسمی لوازمات کی تربیت نہیں خود زندگی کی آراستگی ہے۔ آج مغرب میں روشن دماغ لوگوں کا ایک کثیر گروہ اس امر کا قائل نظر آتا ہے کہ اگر کسی قوم کی ایک ناقابلِ التفات اقلیت فنونِ جمیلہ میں خاص دسترس رکھتی ہو تو اُس چھوٹی سی جماعت کا وجود تمام قوم کو پروانۂ تہذیب دلا دینے کے لئے کافی ہے خواہ اُس قوم کی غالب اکثریت اپنے نظامِ معاشرت کی بنا پر حد درجہ ذلیل و حقیر طریقِ زندگی اختیار کرنے

پر ہی مجبور کیوں نہ ہو۔ یہ روشن خیال گروہ تو اِسی پر بس نہیں کرتا بلکہ اس امر کا بھی قائل نظر آتا ہے کہ کسی قوم کی اقلیت کا فنونِ لطیفہ میں مہارت تامہ پیدا کر لینا اُس قوم کی اکثریت کو غلامانہ اور ذلّت آمیز زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنے کا ایک معقول جواز ہے۔

آپ حضرات میں سے بعض کو تو غالباً انگلستان کے اخبارات کی ایک بحث یاد ہو گی۔ معمہ ملاحظہ ہو۔ "فرض کیجئے کہ ایک کمرے میں یونانی صنعت کا ایک نادر روزگار اور بے بدل مجسمہ موجود ہے اور قریب ہی ایک بچہ بھی سو رہا ہے اگر کمرے میں آگ لگ جائے اور دونوں میں سے صرف ایک ہی کو بچایا جا سکتا ہو تو آپ کی رائے میں کِسے بچانا چاہیئے"۔ اخبار کے بہت سے نامہ نگار حضرات نے جن میں اکثر صاحبِ حیثیت تعلیم یافتہ اور روشن دماغ لوگ شامل تھے جواب دیا کہ "بچے کو نذرِ آتش کر دیا جائے اور مجسمے کو بچا لیا جائے"۔ اس ظالمانہ اور جاہلانہ فیصلے کے لئے دلیل یہ تراشی گئی کہ بچے تو ہزاروں بلکہ لاکھوں روزانہ وارد ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن یونانی صنعت کا ایسا بے بدل مجسمہ دوبارہ کیونکر دُنیا کو نصیب ہو گا۔ ایسی بے رحمانہ اور معصوم کُش رائے تو مسلمان

کے وہم وگمان کی سرحد سے بھی منزلوں دُور ہے۔ یہ جنون عہدِ حاضر کی مہذب بُت پرستی نہیں تو اور کیا ہے ؟

اسلام بنی نوع انسان کے لئے ایک درخشاں مستقبل پیشِ نظر رکھتا اور اُس کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ مسلمان خدا کی راہ میں (کہ یہ خدمتِ خلق ہی سے عبارت ہے) اپنی جان کو پرکاہ سے بھی زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ لیکن فنونِ لطیفہ کے شاہکاروں پر حقیر سے حقیر انسانی زندگی کی قربانی اُس کے وہم وگمان سے بھی بالاتر ہے۔ فنون لطیفہ کی پرستش اور یہ اعمال اسی نام سے موسوم ہونے چاہئیں اللہ تعالٰی کی ہدایت اور تخلیقِ آدم کے مقصد سے بے خبری و بے یقینی پر مبنی ہے۔ ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ یہ نایاب مظاہرِ فنون انسان نے صدیوں میں پیدا کئے اب حسن و جمال نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ انسانی کمالات رو بہ تنزل ہیں لہذا ہمیں عہدِ گزشتہ کے ان پیکرانِ جمیل سے کہ صنعتِ انسانی کا کمال ہیں ایک گونہ شیفتگی ہونی چاہیئے۔ یہ استدلال تو تاریکی اور یاس کا پیغام ہے لیکن اسلام نور و اُمید کی جلوہ گری کا نام ہے۔ اسلام مروجہ معنوں میں تقدیر پرستی کی تعلیم نہیں دیتا۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ کوئی ناگوار صورتِ حال تمہارے لئے لازم کر دی گئی

ہے اسلام تو اصلاحِ حال کی ایک سعی پیہم کو جزوِ زندگی اور لازمۂ حیات قرار دیتا ہے۔

اسلام کا مقصد وحید انسانی ترقی ہے اسلام حصولِ ترقی کی راہیں اپنے ایسے اوامر و نواہی سے جو انسان کی روز مرہ کی زندگی کے ہر شعبہ۔ اُس کی معاشرت۔ اُس کی سیاست اور اُس کے دل و دماغ اور اُس کی روح کے ہر جذبہ پر حاوی ہیں روشن اور معین کر دیتا ہے۔ یہ اوامر و نواہی ایک مکمل ضابطۂ معاشرت اور نظامِ سیاست میں مربوط ہیں اسلام کا نظام ایک عملی نظام ہے اور ایسی محیر العقول کامیابی کے ساتھ زیرِ عمل رہ چکا ہے جس نے مؤرخ کو انگشت بدنداں کر رکھا ہے۔

اکثر مصنفین نے تو اسلام کی عدیم المثال کامیابی کو خارجی اثرات مثلاً قریبی سلطنتوں کے انحطاط۔ فتوحاتِ شمشیر اور اُس زمانے کی سریع الاعتقادی پر محمول کیا ہے۔ لیکن یہ لوگ اس حقیقت کی کیا توجیہ پیش کریں گے کہ خود مسلمانوں نے جب تک اسلام کے کسی خاص حکم کی متابعت کی وہ اُس حکم کے حلقۂ عمل میں کامیاب ہوئے اور جب انہوں نے شریعت کے کسی حکم سے روگردانی کی تو اُس حکم کے حلقہ اثر میں جو کامیابی مقدر تھی

وہ اُس سے محروم رہ گئے۔ ان لوگوں کے پاس اس بات کا کیا جواب ہے کہ مسلمان کو جن احکام کا پابند قرار دیا گیا ہے اگر نامسلم اُن میں سے کسی پر عامل ہوں تو اُس شعبۂ زندگی میں انہیں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ احکامِ قرآنی اور ارشاداتِ نبویؐ تمام نوعِ انسان کے لئے ہیں۔ اسلام قوانینِ فطرت کا ایک مرقع ہے ان قوانین کی خلاف ورزی افراد و اقوام کو خسارے میں ڈالتی ہے۔ کیونکہ ایسے قوانین انسانی تجربہ سے منکشف نہیں ہو سکتے تھے اور تاریخ کے اوراق میں کبھی کبھار کوئی صاحب فہم و فراست ہی اُن کا سُراغ لگا سکتا تھا لہٰذا ایک رسول کی معرفت اُن کا الہامی صورت میں انکشاف ہوا وگرنہ وہ تو ہمارے قوانینِ طبعی کی طرح شک و شبہ کی گنجائش سے بالاتر قوانینِ فطرت ہیں۔ دوسرے مذاہب اُن لوگوں کے لئے جو جسمانی ریاضتوں اور بھوک کے عذاب سے اس دُنیا میں اس کا استحقاق پیدا کریں اگلی دُنیا میں کامیابی کا وعدہ کرتے ہیں لیکن اسلام تمام اُن لوگوں کو جو بعض قوانین کو اصولِ زندگی بنا کر اُن پر عمل پیرا ہوں اس دُنیا اور عاقبت دونوں میں برابر کی کامیابی کا مژدہ سناتا ہے۔

مسلمان کے نزدیک دُنیا اور آخرت کی تقسیم بے معنی ہے کیونکہ

زمینوں اور آسمانوں کا مالک خدا اس دُنیا اور آنے والی دُنیا دونوں کا شہنشاہ ہے۔ تمام اُن لوگوں کی عاقبت جو سچے معنوں میں مسلمان بن جائیں اور خدا کی رضا جوئی کا حق اسی طرح ادا کریں جیسے رسولِ خدا نے اپنے ارشاد " مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا " (مرنے سے پہلے مر جاؤ) میں کہا تھا موت کے بعد نہیں اسی زندگی میں شروع ہو جاتی ہے۔

اسلام نے اس دُنیا میں جس کامرانی کا وعدہ فرمایا ہے وہ کسی انسان کی ایسی کامیابی نہیں جس سے دوسروں کی ناکامی و نامرادی لازم آئے اور نہ ہی اُس سے مُراد کسی قوم کا ایسا عروج ہے جس کی بنیاد کسی دوسری قوم کے زوال پر استوار کی جائے۔ اسلام نوعِ انسان کے لیئے ایک ہمہ گیر کامرانی کا پیغام ہے۔

دُنیا کی ہر مسجد سے پانچ مرتبہ روزانہ حی علی الفلاح۔ حی علی الفلاح کی صدا فردوسِ گوش ہوتی ہے۔

فلاح کے معنے عربی زبان میں کاشت کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنا ہے مسلمانوں میں ایک دوسرا لفظ زکوٰۃ مروج ہے جس کے اصطلاحی معنوں کا علم اُس کے لغوی مفہوم کو پوشیدہ کیئے ہوئے ہے زکوٰۃ کے معنے تراش کر بڑھانا اور سیدھا بڑھانا ہے زکوٰۃ کا اصطلاحی

مفہوم وہ اسلامی ٹیکس ہے جس کی تلقین قرآنِ کریم میں عبادت کے ساتھ بہ تکرار آئی ہے۔ زکوٰۃ حقیقت میں قوم کی نشو و نما اور بالیدگی کا باعث تھی۔ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ ٹیکس امیر سے وصول کیا جائے گا اور غریب پر تقسیم کیا جائے گا۔ جب زکوٰۃ باقاعدگی سے وصول کی جاتی تھی تو مسلمانوں کی حالت اس درجہ قابلِ اطمینان تھی کہ زکوٰۃ تقسیم کرنے والوں کو باوجود تلاش و جستجو مستحقین زکوٰۃ یعنی نادار مسلمان نہیں ملتے تھے اور یہ روپیہ امورِ رفاہِ عامہ پر صرف کیا جاتا تھا۔ قرآن کریم فرماتا ہے:۔

قد افلح من زکھا۔ وقد خاب من دسھا

(وہ یقیناً کامیاب ہے جو اسے (روح انسانی کو) نشو و نما دے اور وہ یقیناً ناکام ہے جو اس کی بالیدگی کو روک دے اور دبائے۔)

اس کے بعد:۔

قد افلح من تزکیٰ ٥ و ذکر اسم ربہ فصلیٰ ٥

(وہ یقیناً کامیاب ہے جو بالیدگی حاصل کرتا ہے اور اللہ کا نام لیتا اور دعا کرتا ہے۔)

ممکن ہے بعض دلوں میں خیال پیدا ہو کہ یہ محض بلند پایہ اعتقادات

ہیں جن کا زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔ لیکن اسلام عمل ہی کا نام ہے اور یہ احکام تاریخ اسلام میں ایسے الفاظ نہیں جو شرمندہ معنی نہ ہوئے ہوں۔ زکوٰۃ کی شکل میں اسلام نے دنیا کے سامنے امداد وخیرات کا وہ عظیم الشان نظام پیش کیا جس کی بدولت صدیوں دنیائے اسلام کے جملہ معاشری مسائل کی طرف سے اطمینان حاصل رہا۔ قرآن کریم ہمیں مطلع کرتا ہے کہ حقیقی مذہب کسی قیاس یا وضع نہیں بلکہ عمل ہی کا نام ہے۔

الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت

(جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کئے)

قرآن کریم میں اس ارشاد کا کس قدر تکرار ہے "وہ لوگ جو ایمان لائے اور کچھ نہیں کرتے" اسلام میں اُن کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ "جو لوگ ایمان لاتے اور گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں" اُن کا وجود ناقابلِ تصور ہے کیونکہ اپنے آپ کو خدا کی رضا جوئی اور اُس کے قانون کی متابعت کے لئے وقف کر دینا ایک جمود نہیں کوشش وعمل ہی کا نام ہے۔

اسلام کے دورِ عروج میں دینی اور دنیوی تعلیم میں کوئی امتیاز نہ تھا تمام تعلیم حدودِ مذہب ہی میں شامل تھی۔ زمانہ حال کا ایک

مغربی مصنف رقمطراز ہے کہ "یہ اسلام ہی کا کارنامہ تھا کہ اُس نے دوسرے علوم کی تعلیم کو مساجد میں قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم کا مرتبہ عطا کیا " مسجد میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ کیمیا، طبعیات، نباتات، طب اور فلکیات کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مسجد ہی مسلمانوں کے دورِ اوّل میں اُن کی یونیورسٹی تھی اور ہر لحاظ سے اس لقب کی حقدار۔ کیونکہ مسجد کی حدود کے اندر "علم" پر کوئی پابندی نہ تھی۔ مسجدوں کے دروازے اور مسلمانوں کے دل حصول و اشاعتِ علم کے لئے کھلے ہوئے تھے۔

چونکہ دورِ اوّل کے مسلمانوں نے تمام علوم کے شرف و اتحاد کو عملی طور پر تسلیم کیا اس لئے اُس دور کی اسلامی تصانیف کے پڑھنے والے کو آج بھی اُن مصنّفین کی مسلّمہ متانت و سنجیدگی اور اُن کے علم و فضل کا معترف ہونا ہی پڑتا ہے۔

اسلام دین و دنیا میں کسی تفریق کا روا دار نہیں۔ ایک سچا مذہب انسان کے تمام اعمال پر حاوی ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے نیکی اور بدی کی تمیز واضح کر دی ہے۔ انسانی ترقی کے لئے نیکی سُود مند اور برائی مضر ہے۔ اسلام کی بنا عقلِ سلیم ہے۔ اسلام میں ایسے شخص کے لئے جو سینٹ آگسٹائن کی طرح یہ کہتا ہو کہ

"میں تو اس لئے مانتا ہوں کہ یہ ویسے ایک ناقابلِ فہم چیز ہے"
قرآنِ کریم صاف صاف اور بار بار ایسے مذہب کو جس کی بنا عقلِ سلیم پہ نہ ہو باطل قرار دیتا ہے اور بار بار لوگوں کو مذہبی امور میں عقل و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

تاریخِ عالم کا تجربہ ایک طرف تو یہ ثابت کرتا ہے کہ انسانی ترقی کے لئے ایک معقول حد تک آزادیٔ فکر لازم ہے اور دوسری طرف یہ بتاتا ہے کہ جو قومیں خدا سے منکر ہو جاتی ہیں قعرِ مذلت میں گِر جاتی ہیں۔ کیا آزادیٔ فکر اور خدا پہ ایک زندہ ایمان اجتماعِ ضدین ہے؟

مغربی مفکرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ آزادیٔ فکر اور خدا پہ ایمان یکجا نہیں جمع ہو سکتے۔ عروجِ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں نے خدا پر ایمانِ محکم کے ساتھ ہر مضمون و موضوع پہ آزادیٔ فکر کو یکجا کر کے دکھا دیا۔

اسلام نے کسی چیز کو بھی اس قدر مقدس نہیں سمجھا کہ اسے تنقید سے بالاتر قرار دیا جائے۔ فوق العادت اور ماورای فہم صرف ایک ہی ذات ہے جس کی وحدت ایک مرتبہ تسلیم کر لینے کے بعد اُس ذات سے متعلق چون و چرا کے تمام دروازے بند

ہو جاتے ہیں۔ وہ سب کے لئے ایک ہے۔ سب کے لئے رحمٰن و رحیم ہے۔ اُسی نے انسان کو زیورِ عقل سے آراستہ کیا۔ مسلمان مصنفین نے عقل و فکر ہی کو سب سے بڑا عطیۂ الٰہی قرار دیا ہے اور اللہ کی راہ میں یعنی نیکی کے حصول اور بدی سے فرار میں اُس کے استعمال کی تاکید کی گئی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مسلمان کو شریعت کی رہنمائی کا شرف حاصل ہے اسلام میں خدا اور انسان کے درمیان کسی واسطہ کی ضرورت نہیں۔

ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعہ عن العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤسا جہالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا۔

اللہ علم کو یکسر چھین کر نہیں معدوم کرتا یا یں طور کہ وہ اس کو بندوں سے چھین لے بلکہ وہ علماء کو اُٹھا کر علم کو بھی اُٹھا لیتا ہے یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں چھوڑتا تو لوگ جاہلوں کو پیشوا بنا لیتے ہیں ان سے پوچھا جاتا ہے تو بغیر جانے بوجھے فتویٰ دیتے ہیں اس طرح خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ

کرتے ہیں "

ان الملائکۃ لتضع اجنحتہا لطالب العلم

بے شک فرشتے علم کے طلبگاروں پر اپنے پر پھیلا دیتے ہیں۔

ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون

کیا علم رکھنے والے اور وہ لوگ جو علم نہیں رکھتے برابر ہو سکتے ہیں ؟

فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم

" عالم کی فضیلت عابد پر اتنی ہی ہے جتنی کہ میری تمہارے ادنیٰ ترین فرد پر "

آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص نمازیں پڑھے روزے رکھے، زکوٰۃ دے، حج کرے اور دوسرے فرائض مذہبی کی پابندی کرے لیکن اس کا اجر اس کے فہم و فراست کے تناسب ہی سے ہوگا جو اس نے استعمال کی ہے۔ حضورؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ " ایک عالم بے عمل اُس گدھے کے مانند ہے جس پر کتابیں لاد دی جائیں "

قرآن حکیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان اور جہالت کے اجتماع کا کبھی تصور ہی نہیں فرمایا۔ فی الحقیقت اسلام اور جہالت ایک جگہ جمع ہو نہیں سکتے۔ اسلام کے دورِ اوّل میں نادار مسلمان کی طرح بے علم مسلمان بھی ڈھونڈھے سے نہ

ملتا تھا۔

مذہب پر اسلام کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے مذہب کو اپنے حقیقی میدان عمل یعنی روز مرہ کی زندگی سے روشناس کر دیا۔ قرآن کریم میں جس نور الٰہی کی طرف اشارہ ہے وہ ہر اُس شخص پر عیاں ہے جو اللہ کی ہدایت کی پیروی کرتا ہے کیونکہ وہی نور ہماری روز مرہ کی زندگی میں اللہ تعالےٰ کی بزرگی و برتری پر ایمان کی صورت میں ہماری مشعل راہ ہے۔ مذہب کے پیش نظر کسی آئندہ زندگی کا حصول دراز مقصد نہیں اس کی غایت تو آج اس دُنیا میں اور اس وقت بنی نوع انسان کی خدمت ہے عرب کے بُت پرست آنحضرت صلعم سے حضور کے پیغام کی صداقت کی دلیل کے طور پر معجزہ کے طالب تھے۔

وقالوا مال هذا الرسول ياكل الطعام ويمشى فى الاسواق لولا انزل اليه ملك فيكون معه نذيرا او يلقى اليه كنز او تكون له جنة ياكل منها وقال الظالمون ان تتبعون الا رجلا مسحورا۔

اور وہ کہتے ہیں یہ کس قسم کا خدا کا رسول ہے کہ کھانا کھاتا اور بازاروں

میں پھرتا ہے کیوں ڈرانے کے لئے اس کے ساتھ کوئی فرشتہ
نہیں بھیجا گیا۔ یا پھر اس پر کسی خزانے کے منہ کیوں نہیں
کھول دیئے گئے یا پھر اس کو کوئی ایسا بہشت کیوں نہیں عطا
کیا گیا جس سے وہ کھا سکے، بدکار لوگ کہتے ہیں تم ایک مجنوں
کی متابعت کر رہے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے بدکاروں کو جن الفاظ میں جواب دیا اس
سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معجزات پیغمبر کی صداقت کا ثبوت
نہیں پیغمبر کا کام تو انسانوں کی عقلوں کو آراستہ اور اُن کے
ذوق جستجو کو بیدار کرنا ہے۔

وما ارسلنا قبلك من المرسلين الا انهم ليأكلون
الطعام ويمشون في الاسواق۔

ہم نے تم سے پہلے ایسے ہی پیغمبر بھیجے ہیں جو تمہاری طرح کھاتے
تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ پہلے تمام پیغمبر بھی جنہیں لوگ
فوق العادت ہستیاں سمجھتے تھے انسان ہی تھے جو لوگوں کو
خدا کے نام پر خدا ہی کی طرف دعوت دیتے تھے۔ معجزات
تعلیم اسلامی کے مطابق مامور من اللہ ہونے کا ثبوت نہیں

اور نہ ہی وہ قوانینِ قدرت کی خلاف ورزی کر سکتے ہیں کیونکہ قوانینِ قدرت خود خدا ہی کے وضع و رائج کیے ہوئے ہیں لہذا قوانینِ الٰہی ہی ہیں

معجزات تو انسانی ترقی کی منزلِ مقصود کے ایسے مقامات کی شہادتیں ہیں جن پر ایسے قوانین جو عوام کی نظر سے پوشیدہ ہوتے ہیں معرضِ ظہور میں آجاتے ہیں۔ حضور رسالت مآبؐ کی طرف بھی بہت سے معجزات منسوب ہیں لیکن کوئی مسلمان اُن معجزات کو حضور نبی کریمؐ کی نبوّت کے ثبوت کے طور پر پیش نہیں کرے گا۔ حضور کا پیام اور اس کی کامیابی یعنی قرآن کریم اُس کی تبلیغ اور اُس تبلیغ و اشاعت کے ثمرات حضور نبی کریمؐ کی صداقت کے ایسے قطعی اور روشن دلائل ہیں جو معجزات کی ضرورت سے بالاتر ہیں۔

اگرچہ آج جہالت اور توہّم پرستی نے مسلمانوں کو لایعنی روایات اور بے معنی معتقدات کا قائل و حامل بنا رکھا ہے لیکن جہاں قوم کے مسلّمات نے انسانی دماغ کو ایسی بلندی عطا کی ہو وہاں نامعقول معتقدات کا نشو و نما پانا ناممکن ہو جاتا ہے اصل میں روایات اور توہّمات کا ایک بہت بڑا حصّہ تو ایک

گزشتہ سائنس کا سرمایہ ہے اسلام یہ توقع رکھتا ہے کہ عہدِ ماضی کی اس سائنس کو علوم حالیہ کی روشنی میں بدل دیا جائے۔ اگرچہ مسلمان ہر معاملہ میں آزاد ہے لیکن اپنی جسمانی دماغی اور روحانی صحت و عافیت کے لئے اُس پر ایک ضابطہ کی پابندی لازم ہے۔ اس پابندی کے اندر اندر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے زمانہ کی سائنس کا خوب غور و خوض سے مطالعہ کرے اور اُس میں جو کچھ اُسے معقول نظر آئے اُسے قبول کرے اور ایسا کرنے میں اُسے اُن غلط قیاسات اور بےمعنی معتقدات کو جو مسلمان سے منسوب ہو چکے ہیں خیرباد کہہ دینے میں ہرگز کوئی باک نہ ہونا چاہیئے۔ سائنس کے حقائق کو مان لینے اور بےمعنی قیاسات اور مظنونات کے چھوڑ دینے سے مسلمان کے ایمان پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

مسلمان کا ایمان اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ بقول اُس قابلِ احترام بڈھے کافر کے "ایک ابدی حقیقت اور ایک لازمی افسانہ سے عبارت ہے"، رگبن کو بھی تو خواہی نخواہی اقرار کرنا ہی پڑا کہ اس افسانہ نے واقعات کی روشنی میں اپنا پورا پورا جواز پیدا کر لیا۔

ملت اسلامیہ میں آج قصص و روایات کے دقیانوسی پردے ہٹا کر تعلیماتِ اسلامی کے پیکرِ جمیل کو دیکھنے کی ایک روز افزوں تمنا پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن یہ خارجی پردے جو اسلام کے روشن چہرے پر ڈال دیئے گئے ہیں عیسائیت کی طرح اسلام کی حقیقت کو مسخ نہیں کر سکے۔ اسلام کا باطن آج بھی بہ آسانی عیاں اور واضح ہے۔ قرآن کریم میں صحیفہ قدرت یعنی دن اور رات کے تغیر۔ خاک و باد و آب و آتش کے خواص اور نمو و اختلاط اور موت و حیات کے اسرار کے مطالعہ کی تاکید ہے اور یہ شواہد ہیں اُس قانون و نظام کے جسے انسان نہ بنا سکا نہ بدل سکتا ہے۔ اور ثبوت ہیں اس حقیقت کا کہ اس دُنیا میں انسان کی فرماں روائی نہیں ہے اور یہ کہ اُس کی آزادیٔ رائے۔ اکتشاف اور کامیاب کوشش تو ایک قطعی سلطانیت میں مفوضہ اختیارات کا حکم رکھتی ہے۔ یہ قطعی بادشاہت صرف اللہ ہی کے لئے ہے جو دُنیا کا خالق، پروردگار اور ربّ العالمین ہے۔ انسان حقیقت میں اپنی طبعی حالت اور اسباب ربوبیت کی فراوانی پر کہ وہ ہر حالت

میں اُس کا ساتھ دیتے ہیں کبھی غور نہیں کرتا۔ قوتِ تخلیق کے
ایک حیرت انگیز مرقع میں گھرا ہوا انسان ایک ایسی دُنیا
میں بھیجا گیا ہے جہاں ایک ایسے ضابطہ قوانین کے ماتحت
زندگی بسر کرنا ہوتی ہے جس کی کبھی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔
وہ لازماً اس ضابطہ کے ماتحت ہے کیونکہ وہ ان قوانین کی
کہ وہ اس کے بنائے ہوئے نہیں ہیں متابعت بغیر کسی مسئلہ
پر غور کرنے۔ زبان ہلانے، اُنگلی اُٹھانے حتیٰ کہ سانس لینے
پر بھی قادر نہیں۔ انسان فی الحقیقت ایک کیڑے کی طرح
اپنی محدود دلچسپیوں کی دُنیا میں ایسا مبتلا ہے کہ اُن
امور پر اُس کو غور و فکر کی مہلت ہی نصیب نہیں ہوتی۔
انسان اپنے محدود دائرہ کی پرستش کرتے ہوئے ایک ایسے
خدا کا طالب ہوتا ہے جو مقصدِ تخلیق اور ضروریاتِ مخلوق
کو پسِ پشت ڈال کر اُس کے مقاصد مخصوص کے حصول میں
اُس کا معاون ہو۔ بلاشبہ اگر ہم ایک خالق اور مقصدِ تخلیق
مانتے ہیں تو ہمیں کسی خاص سلوک کی توقع نہ رکھنا چاہیئے
بلکہ ہمیں اُسی مقصدِ تخلیق اور مشیت الٰہی کی اطاعت و مطابقت
ہی میں کامیابی کی اُمید رکھنی چاہیئے۔

كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ ۝ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰٓ ۝ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰٓ ۝

ترجمہ:- کوئی نہیں آدمی سر چڑھتا ہے اس سے، کہ دیکھے اپنے آپ کو بے پرواہ، بیشک تیرے رب کی طرف پھر جانا ہے۔

چند سال ہوئے ایک سکاچ پادری کی کتاب نے جو "روحانی دنیا میں قانونِ فطرت" کے نام سے شائع ہوئی انگریزی خواں دنیا میں ایک ہلچل سی ڈال دی۔ کتاب تو کچھ اچھی نہ تھی مگر میں نے صرف اس کے عنوان کی مناسبت سے اس کا حوالہ دیا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کو زیادہ موزونیت کے ساتھ "روحانی، معاشرتی اور سیاسی دنیا میں قانونِ فطرت" کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اسلام اللہ کی حقیقی بادشاہت کے ثبوت میں ہماری طبعی زندگی پر حاوی قوانینِ قدرت کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے اور پھر یہ ثابت کرتا ہے کہ بعینہٖ ایسے ہی قوانین انسان کی روحانی اور اجتماعی زندگی پر حاوی ہیں۔ پیغمبروں کے معجزات اور اولیاءؒ کی کرامات کو اس قدر معمولی قرار دیا گیا ہے کہ ان پر اعتقاد لانا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ مسلمان کے ایمان کی بنا اللہ کی

عالمگیر بادشاہت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور تمام پیغمبروں کے من جانب اللہ ہونے کا اقرار ہے۔ اسلام کی یہی فطری اور معقول بنا تھی جس نے جرمنی کے شہرۂ آفاق شاعر گوئیٹے سے جب وہ قرآن کریم کا ترجمہ ختم کر چکا تو کہلوایا کہ "اگر یہی اسلام ہے تو ہم میں سے ہر سوچنے والا انسان مسلمان ہے"

آج کل ایک فریق جسے اپنا ڈھول پیٹنے میں مہارتِ تامہ حاصل ہے تہذیبِ اسلامی پر صرف اس لئے معترض ہے کہ یہ تہذیب اصولِ جمہوریت، اشتراکیت، امرائیت یا دورِ حاضر میں تجربہ کئے گئے اور ایک حد تک ناکام پائے گئے کسی دوسرے اصول پر مبنی ہونے کے بجائے خاص الٰہیت پر مبنی ہے تہذیبِ اسلامی کی الٰہیت بھی تو کوئی ایسی چیز نہیں جس کی یاد صرف بوقتِ عبادت تازہ کر لی جائے اور جسے عملی دُنیا کے ہر کام میں پورے اطمینان سے فراموش کر دیا یا پسِ پُشت ڈال دیا جائے بلکہ اسلامی الٰہیت تو ایک زندہ اور ابدی قانون ہے جس پر ہر زمانے میں عمل ہُوا ہے۔ یورپ کے ایک بہت بڑے مُدبّر نے کہا ہے کہ خدا کا

سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ اُن لوگوں کی نظر میں جو واقعات و حالاتِ حاضرہ کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں مغربی سیاست کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ وہ تدبیر کی مضبوطی کے زعم میں کرشمۂ تقدیر اور دستِ غیب کی نیرنگی کی منکر ہو جاتی ہے۔ لیکن خدا کا اَن دیکھا ہاتھ محکم ترین انسانی تدبیروں کو اُلٹ کر رکھ دیتا ہے۔ مکافاتِ عمل کا قانونِ الٰہی اب بھی جاری ہے۔ نیکی کا بدلہ نیک ہے اور بدی کی سزا انجام کار بدی ہے۔ یہ قانون ہمارے آنکھیں بند کر لینے سے اپنا عمل نہیں بدل لیتا۔ عہدِ حاضر میں انقلابِ روس اور یونانیوں کی ٹرکی کو تباہ کرنے کی کوشش کی ناکامی اِسی حقیقت کے ناقابلِ انکار شواہد ہیں کہ خدا کا چھپا ہوا ہاتھ کس طرح بڑے بڑے مُدبّرین کی پختہ تدبیروں کو جن کی کامیابی انسان کی نظر میں اٹل ہو چکی ہوتی ہے چشم زدن میں خاک میں ملا دیتا ہے۔

خدا کی بادشاہت سے متعلق جس کی اسلام نے تلقین فرمائی ہے اور جس کے قیام میں وہ ایک گونہ معاون ہوا میں سمجھتا ہوں موجودہ دَور کی روش الزمنۂ متوسط سے مختلف

نہیں ہے معترضین کا استدلال ایک غلط مماثلت پر مبنی ہے۔ الٰہیت کا وہ نصب العین جو قرون وسطیٰ میں مغرب میں پایا جاتا تھا کلیسائی مراسم اور معجزانہ روایات سے منسوب تھا اور اس الٰہیت کو اس بدمعاش اور بدقماش دنیا سے جائے فرار سمجھا جاتا تھا لہٰذا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ تمام الٰہیتیں لازماً ناقابلِ عمل ہیں اور تارک الدنیا لوگوں کے فلسفوں اور مذہبی مجنونوں کے قیاسات سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں آج سائنس نے معجزات کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور انسانوں نے اس دنیا کی دولت سے فائدہ اٹھانا اور ذہنی دنیا میں اپنی حالت کا سنوارنا ہی اپنا فرض سمجھ لیا ہے۔ مگر بہترین انسان تو وہ ہیں جو ذاتی آسائش سے زیادہ دوسروں کی حالت سنوارنے کی فکر کریں پس الٰہیت کا ایسا نصب العین جس کی بنا معجزات پر تھی جو حقیقی انسانی ضروریات سے کوسوں دور تھا۔ وہ نصب العین جو اس دنیا کو شیطان کی سلطنت سمجھتا تھا اور جو ہر نجات چاہنے والے کو اس سے دور بھاگنے کا سبق دیتا تھا فی الحقیقت ایک پیامِ یاس تھا اور اُسے واقعی دقیانوسی اور حالاتِ حاضرہ میں ناموزوں سمجھنا

چاہیئے۔ لیکن الہیت کا وہ نصب العین جس کی بنیاد حق و صداقت پر ہو ایسے سلوک کا مستحق نہیں۔ سچ پوچھیے تو موجودہ زمانہ اپنی ہلاکت آفریں خود غرضیوں کی وجہ سے ایک ایسے نصب العین کا پیاسا ہے اور یہ وہ نصب العین ہے جس کی بنیادیں فطرتِ انسانی پر استوار ہونے کی وجہ سے افکارِ انسانی کی ترقی اور سائینس کے اکتشافات سے متزلزل نہیں ہو سکتیں۔ سائینس کی ترقی فطرت کے عجائبات کو جتنا بے نقاب کرتی جاتی ہے اتنی ہی شدت کے ساتھ ایک سچے مسلمان پر اللہ کی قدرت، پروردگاری اور حاکمیت عیاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب تک قوانینِ قدرت قائم ہیں اور افراد و اقوام کے افعال کے اچھے اور بُرے نتائج مترتب ہوتے رہتے ہیں تب تک انسان کو انسانی زندگی میں اپنی رائے اور مقصد سے ایک بلند تر رائے اور مقصد اور ایک بلند تر فیصلے کا وجود تسلیم کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور تب تک انسان کو اسی رضا اور مقصدِ اعلیٰ پر اپنے آپ کو حوالہ کر دینے کی ضرورت قائم رہتی ہے اور تعلیم قرآنی کے مطابق اسی رضائے اعلیٰ اور مقصدِ ارفع کا نام ہی اسلام ہے۔

کہ موجودہ نظامِ معاشرت کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں ۔ اور عہدِ حاضر نے اشتراکیت ۔ فاشیت ۔ فوضویت ۔ بالشویت اور دوسرے جتنے نظامات بدل کے طور پر پیش کئے ہیں، اسلام اُن کے مقابلہ میں ایک کامل نظامِ سیاست و معاشرت پیش کرتا ہے ۔ اسلامی نظام کو دوسرے تمام نظامات پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہ تاریخِ عالم میں نمایاں کامیابی کے ساتھ زیرِ عمل رہ چکا ہے اور اس پر جتنی شدت سے عمل ہُوا ہے اتنی ہی زیادہ مکمل کامیابی مترتب ہوئی ہے ہر مسلمان کو اس امر کا یقین ہے کہ ہر قوم انجام کار اسلام کے بنیادی اصول ضرور قبول کرے گی خواہ وہ اصطلاحی معنوں میں قبول اسلام کا اعلان نہ بھی کرے ۔ کیونکہ اسلامی قوانین فطری یا سماوی قوانین ہیں جن پر انسانی ترقی کا دار و مدار ہے ۔ انسان اس الہام کے بغیر ایک مدت گذرنے اور تلخ تجربات سے دوچار ہونے اور دوسرے طریقوں کو اختیار کرنے اور اُن کی ناکامی کی تلخی سے آشنا ہونے کے بعد اُن قوانین کا ضرور پتہ لگا لے گا ۔ اسلام اقوام اور جماعات کے موجودہ تصادم اور تزلزل کے بجائے امن و

استقلال کی بشارت دیتا ہے۔ اس نظام کے حسن و قبح کے جانچنے سے کسی شخص کا محض اسی بنا پر انکار کر دیتا کہ اس نظام کی بنیاد خدا پر اعتقاد ہے اور کہ یہ نظام ایک پیغمبر کی وساطت سے دُنیا پر منکشف ہوا حماقت اور کافرانہ تعصب نہیں تو اور کیا ہے۔

لیکن یاد رکھئے نظام اسلامی سے دُنیا صرف اسی لئے نفور نہیں ہے کہ اُس تہذیب کی بنا وجودِ باری تعالےٰ کا اقرار و اعتراف ہے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی وہ حالت وحیثیت ہے جس پر اب ایک زمانہ گذر چکا ہے۔ قرونِ وسطےٰ کے عیسائی تو اس تہذیب کے جاننے اور سمجھنے سے عاری تھے کیونکہ عیسائی کی رگِ جاں تو پادری کے پنجہ میں گرفتار تھی اور یہ پادری آج کے پادریوں کی طرح ہی رسولِ مقبولؐ کو نعوذ باللہ جھوٹا نبی کہتے تھے اور کسی عیسائی کو یہ وہم و گمان بھی نہیں کرنے دیتے تھے کہ ایسے نبی کا مذہب دُنیا کے لئے کسی بہتری اور فائدے کا کوئی امکان رکھتا ہے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں میں آج سے کچھ دیر پہلے تک جنگوں نے ایک حدِ فاصل قائم کر دی تھی جس کی وجہ سے

تعصب و منافرت کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔

آج جب کہ وہ سدِّ سکندری درمیان سے ہٹ گئی ہے بدقسمتی سے مسلمان کی حیثیت ایسی نہیں ہے جو دوسروں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کر سکے کہ مسلمان بھی کبھی انسانی ترقی کا راز پائے ہوئے تھے۔

آج مسلمان کی حیثیت اور اس کا عمل تعلیمات اسلامی کا ایک المناک مظاہرہ ہے۔ پس اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے اگر دُنیا مسلمانوں کی ذلت و پستی کو اسلام کی فرمائیگی سے منسوب کرے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری پستی کا الزام اسلام پر اسی طرح عائد نہیں ہو سکتا جس طرح پادریوں کی عیسائیت کو موجودہ مادی ترقی کا ذمہ دار نہیں گردانا جا سکتا۔ عیسائیت میں آزادیِ فکر سرے سے مفقود تھی۔ عیسائی پادری کے پنجہ میں گرفتار تھے وہ زمانہ جب عیسائی چرچ اپنے شباب پر تھا آج دورِ ظلمت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسلام نے انسانوں کو آزادیِ فکر کی دولت سے بہرہ ور کیا۔ اسلام میں مذہبی پیشواؤں کی کوئی جماعت نہ تھی اور وہ زمانہ جب اسلام اپنی آب و تاب سے جلوہ گر تھا

ایک عہدِ درخشاں متصوّر ہوتا ہے۔

جب مسلمانوں نے خالص تعلیماتِ اسلامی سے منہ موڑ کر ملاؤں کو قبول کیا یا بہ اصطلاحِ قرآن اَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کو اپنا حاکم بنا لیا۔ جب وہ لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھے۔ جب اُنہوں نے تلاشِ علم کے حکم کو پسِ پُشت ڈالا۔ جب اُنہوں نے آزادئِ فکر سے انحراف کیا اور جب اُنہوں نے معقولات کو خیر باد کہہ دیا تو نتیجہ ذلّت و زوال کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ اپنی تاریخ کے ایک دَور میں مسلمانوں نے شریعت اسلامیہ کے ایک حصّہ سے۔ اُس حصّہ سے جس میں اُنہیں تلاشِ علم اور کائنات کے مطالعہ کی ہدایت تھی۔ انحراف کیا مگر مغرب کے عیسائیوں نے اُسی زمانہ میں پادریوں کی مخالفت کے باوجود شریعتِ اسلامیہ کے اسی حصّہ پر عمل درآمد شروع کر دیا پس وہ ترقی پا گئے۔

اسلام نے ایسے مذہبی گروہ کی مخالفت کی ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان ایک واسطہ بن کر اُن کی روحوں پر قابض ہو جائے کیونکہ اس قسم کی مذہبیت انسانی ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ ایسی ملائیت جیسے عیسائیوں میں موجود

بھی ایک ایسے دین برحق کے موافق نہیں ہو سکتی جس کا مقصد قرآن کے الفاظ میں غلامی و بربادی نہیں ترقی و آزادی ہے اس وسیع دُنیا کے ہر حصّے میں مسلمان پر یہ حقیقت فاش ہو چکی ہے کہ اپنی موجودہ ذلّت و پستی کا وہ خود ذمّہ دار ہے اور دُنیا میں اعزاز و وقار اور سربلندی و اقبال اُسے دوبارہ صرف اسلام کی متابعت ہی سے میسّر آ سکتے ہیں۔

آپ حضرات خیال فرماتے ہوں گے کہ میں اپنے مضمون تہذیب کو چھوڑ کر مذہب کے میدان کی طرف بھاگتا رہا ہوں لیکن تہذیب اسلامی مذہب سے نہایت گہرے طور پر وابستہ ہے۔ اللہ کی عالم گیر بادشاہت کا اعتراف تہذیب اسلامی کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے پس میں اپنے موضوع تقریر کو بغیر اُن اشارات کے جو میں نے اس وقت پیش کئے مکمل نہیں کر سکتا تھا۔ تہذیب اسلامی کے عہدِ عروج یا دَورِ انحطاط میں جب کبھی آپ سائنس، فنون، ادب، معاشرت یا کسی دوسرے شعبہ میں اس کے کارنامے ملاحظہ کریں۔ خدا کی عالم گیر اور مکمل بادشاہت کے مذہبی اعتراف سے آپ اُسے کبھی خالی نہیں پائیں گے۔ تہذیب اسلامی کا یہی ایک

نشانِ امتیازی ہے اور یہی چیز اسلامی قومیت کو عالم گیر اخوّت کا ہم معنی بنا دیتی ہے۔ کیونکہ اللہ کی عالم گیر بادشاہت کے تسلیم کر لینے کا لازمی نتیجہ بنی نوعِ انسان کی عالم گیر اخوّت کا اعتراف و احترام ہے۔

خطبۂ دوم

اسبابِ عروج و انحطاط

آج اسلام کے جس تہذیبی پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ اس کی انسانیت ہے جس سے مراد بنی نوع انسان کے لئے اسلام کی خیر اندیشی اور نفع رسانی ہی نہیں بلکہ اس کے نقطہ ہائے نگاہ کی عالمگیری بھی ہے۔

اسلام میں مسلم اور غیر مسلم کے لئے علیحدہ علیحدہ قانون و معیار نہیں۔ اللہ کی سلطنت کسی جانب دارانہ سلوک کی حامی نہیں۔ خدا کا قانون سب کے لئے یکساں ہے۔ ایسے مسلمانوں

سے جن کی زبانیں تو قانونِ الٰہی کے اقرار سے خشک ہوتی جا رہی ہوں لیکن جن کا دامن دولتِ عمل سے خالی ہو وہ غیر مسلم زیادہ خوش نصیب ہیں جنہیں قانونِ اسلامی کی پوری پوری عملی متابعت کی سعادت میسر آ گئے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ؕ

سے خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں معیارِ معتقدات کا محض اقرار و تکرار ہی نہیں بلکہ اُن پر عمل ہے۔ اس دُنیا اور آخرت دونوں میں انسان اپنے عمل سے ہی جانچا جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات کے ذہن میں تاریخِ اسلام کا ایک خاکہ ضرور موجود ہے تاریخِ اسلام دُنیائے اسلام کی تین مشہور قوموں اور زبانوں کے نام اور نسبت سے تین بڑے بڑے دَوروں یعنی عربی، فارسی اور ترکی پر تقسیم کی جا سکتی ہے۔ میں یہ بھی فرض کئے لیتا ہوں کہ آپ میں سے ہر صاحب نے یہ ضرور سُن رکھا ہوگا کہ اسلام اپنے دَورِ اوّل میں تلوار کے زور سے پھیلا۔ قرآنِ کریم فرماتا ہے:۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔

ترجمہ۔ زبردستی نہیں دین کے معاملہ میں، بے شک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے، اب جو کوئی نہ ملنے گمراہ کرنے والوں کو اور یقین لاوے اللہ پر تو اس نے پکڑ لیا حلقہ مضبوط جو ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

ایک دوسرا ارشاد ملاحظہ فرمائیے:۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

ترجمہ۔ اور لڑو اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنے والوں کو۔

متعدد آیاتِ قرآنی اس امر کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں کہ مسلمانوں کو محض اختلاف رائے کی بنا پہ کسی شخص سے درشتی سے پیش آنے کی ممانعت ہے۔ مجھے تو اس تعلیم کے

خلاف قرآنِ کریم سے قطعی کوئی جواز ہی نظر نہیں آتا۔ بعد میں جو کچھ بھی پیش آیا ہو اُسے ایک لمحہ کے لئے نظر انداز کر دیجئے۔ اس قدر قطعی ہے کہ اسلام کے دَورِ اوّل میں جب قرآن ہی کا قانون نافذ تھا اور جب شاہ وگدا اُسے کلامِ الٰہی سمجھتے ہوئے ایک محبت آمیز خلوص کے ساتھ اُس کی متابعت کو باعثِ سعادت اور ذریعہ نجات سمجھتے تھے احکامِ قرآنی کی خلاف ورزی محال بلکہ ناممکن تھی۔

اسلام کے تمام غزوات اور محاربات جو خود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں پیش آئے محض مدافعانہ تھے اور اُن جنگوں میں مسلمانوں نے دشمنوں کے ساتھ جس رحم دلی اور مروّت کا ثبوت دیا۔ اس کی مثال اسلام سے پہلے کی تاریخ پیش کرنے سے عاری ہے۔ دَورِ اوّل کے مسلمانوں نے اُس وقت کی نصف دُنیا کو مسخر کر لیا اور ایسا حلقہ بگوش اسلام بنایا کہ آج تک کوئی قوت اُس ایمان کو متزلزل نہیں کر سکی۔ مسلمانوں کا یہ نادر کارنامہ اُن کی تلوار کا مرہونِ منّت نہ تھا بلکہ اُن کے تقوےٰ اور رحم دلی کا ثمرہ تھا کیونکہ مسلمان اُس دَور میں سب لوگوں سے

بڑھ کر ان صفات اعلیٰ اور اخلاق فاضلہ کا نمونہ تھا۔

مسلمانوں کی ہمسایہ اقوام

آئیے ذرا اُس زمانہ کے مسلمانوں کی ہمسایہ اقوام پر نظر ڈالیں۔ مصریوں، شامیوں، میسوپوٹیمیا کے رہنے والوں اور ایرانیوں کو دیکھئے۔ اُن میں نوّے فی صدی لوگ غلام تھے اور صدیوں سے ایسی حالت میں مبتلا تھے بعض ممالک میں عیسائیت کا ظہور بھی اُن لوگوں کی حالت میں کوئی تغیّر پیدا نہ کر سکا۔ عیسائیت حکمرانوں کا مذہب تھا جسے ہر ادنیٰ و اعلیٰ پر مُسلّط کر دیا گیا تھا۔ عوام کے اجسام امیروں کی غلامی کے لئے وقف تھے اور اُن کی ارواح پادری کے پنجۂ اقتدار میں کراہ رہی تھیں۔ عیسائیت کے نصب العین کی تھوڑی سی جھلک نے صرف نجات آخرت کی اُمید بندھا رکھی تھی۔ امیر عیش و عشرت میں مبتلا اور اُس تہذیب کے علم بردار تھے جسے ترقی نہیں بدکرداری اور انحطاط کہا جا سکتا ہے۔ عوام کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ قرب و جوار کے اُن ممالک میں جہاں رسولِ اکرمؐ نے بادشاہوں کے پاس اپنے سفیر بھیج کر انہیں توہم پرستی اور

پادری پرستی کے خلاف تلقین فرمائی اور اُنہیں ایک اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ حضورؐ کے سفیروں سے جو بد سلوکی ہوئی اور نئے مذہب کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنے کے لئے جو جنگی تیاریاں شروع ہوئیں اُن سے اُن ممالک میں ایک کھلبلی ضرور پیدا ہو گئی۔ عوام کو یہ کہہ کر بہکایا اور ڈرایا گیا کہ اسلام (نعوذ باللہ) ایک شیطنت کاری ہے اور مسلمان موت کا پیغام۔ لیکن دُنیا نے جلد ہی دیکھ لیا کہ مسلمان ان ممالک میں فاتحانہ داخل ہوئے اور اُن کے حسنِ سلوک نے اُن تمام اقوام کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا۔

× اِسلام یا تلوار

اُس وقت سے پہلے کی تاریخ انسانی میں مفتوح کی زندگی ہمیشہ فاتح کے رحم وکرم پر موقوف ہوتی تھی خواہ وہ فاتح کا ہم مذہب ہی کیوں نہ ہو اور خواہ اُس کی اطاعت کتنی ہی کامل کیوں نہ ہو۔ غیر مسلموں کا نظریۂ جنگ آج بھی یہی ہے اسلامی قانون جنگ کے مطابق وہ مفتوحین جو اسلام قبول کر لیتے تھے۔ ہر اعتبار سے مسلم فاتحین کے ہم پایہ ہو جاتے

تھے۔ لیکن جو مفتوحین اپنے آبائی مذہب پر قائم رہتے تھے
اُن کو اپنی حفاظت کے لئے ایک ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا جس
کے بعد اُن کو کامل آزادیٔ ضمیر حاصل اور مسلمانوں پر اُن کی
جائیداد اور پیشے کی حفاظت فرض ہو جاتی تھی۔

دُنیا نے "تلوار یا اسلام" کے اصول کی نہایت ہی غلط
توجیہہ پیش کی ہے "تلوار" سے مُراد قتل و غارت اور تباہی و
بربادی نہ تھی صرف جنگ تھی۔ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے والوں
کے سامنے فقط دو ہی راہیں کُھلی تھیں۔ جنگ یا اسلام۔ اسلام
روحانی معنوں میں یعنی دولت اسلام سے مالا مال ہو جانا یا
پھر دُنیاوی معنوں میں ہتھیار ڈال دینا۔ جب تک ان میں
سے ایک صورت پیدا نہ ہو جائے حریف مفتوح شمار نہ ہو
سکتا تھا اور اُس کے خلاف جنگ جاری رہتی تھی یعنی "تلوار
میان میں نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

مسلمانوں نے مصر، شام، میسوپوٹیمیا۔ ایران اور شمالی افریقہ
کے مفتوحین سے باہمی شادیاں کیں اور یہ ایک ایسا اعزاز و
افتخار تھا جو ان ممالک کے باشندوں کو اپنے پہلے فاتحین
کے ہاتھوں کبھی خواب میں بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ اسلام نے

ان لوگوں کو نہ صرف سیاسی آزادی سے بہرہ ور کیا بلکہ اُنہیں ذہنی آزادی سے بھی مالا مال کر دیا۔ اسلام کی بدولت انسانی افکار پر پادری کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ان تمام ممالک کے باشندے سوائے ایرانیوں کے اب عربی کو اپنی ملکی زبان مانتے۔ اپنے آپ کو عربوں کی اولاد بتاتے اور آج تک اسلامی سلطنت کو زمین پر خدا کی بادشاہت کا قیام سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کی رواداری

ان مفتوحہ ممالک کے باشندوں پر جنہیں انسانی زندگی بسر کرنے کا کبھی کوئی موقع نصیب نہ ہوا تھا اسلام کی بخشی ہوئی آزادی نے وہی اثر کیا جو کرنا چاہیئے تھا۔ ان ممالک نے مسلمانوں سے میل جول کے بعد حیرت انگیز ترقی کی۔ سائنس فنون اور ادب میں ان ممالک کے کارنامے آج تک صفحات تاریخ کی زینت ہیں۔ تاریخ کا یہ دَور مسلسل جنگوں کے باوجود نہایت ہی پُرلطف ہے۔ اُس دَور سے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مغربی مورخین کی ہر سطر وحی و الہام نہ سمجھی جائے یا بہ الفاظ واضح تر اُس زمانہ کے دشمنانِ اسلام

کے پروپیگنڈے سے خبردار رہنے کی اشد ضرورت ہے۔

مجھے ایامِ جوانی میں شام کے اُن عیسائیوں سے ملاقات کا کافی موقع میسّر آیا ہے جن کے آباؤ اجداد نے اسلامی فتوحات کے زمانہ میں اپنا آبائی مذہب ترک نہ کیا۔ یہ لوگ اسلام کے دَورِ اوّل کو بہترین زمانہ اور حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہٗ خلیفہ دوم کو اپنے مذہب کا ایک جلیل الشان محسن مانتے ہیں۔ مشہور قومی قصص اور کہانیاں بعض اوقات گذرے ہوئے حالات کے سمجھنے میں تحریری تاریخ سے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں لیکن اگر تحریری تاریخی مواد کے مطالعہ ہی سے صبر اور محنت کے ساتھ حقیقت کی تلاش کی جائے تو ثابت ہو گا کہ اگرچہ عیسائیوں کے ساتھ روا داری سے پیش آنا مسلمانوں کے لئے از حد دشوار بنا دیا گیا تھا پھر بھی عیسائیوں کے خلاف دَورِ اوّل کے مسلمانوں میں مذہبی دیوانگی اور مخالفت کا جذبہ نہیں پایا جاتا تھا۔ بلکہ یہ جذبہ حروبِ صلیبیہ کے بعد پیدا ہوا۔ بہت سے عیسائی اسلام کی علانیہ توہین کے ارتکاب کو ایک مذہبی خدمت اور اس کے نتیجہ کے طور پر قدرتی جذبہ نفرت کے ماتحت حکمرانوں کے ہاتھوں قتل ہونے کو شہادت سمجھتے تھے مختلف ممالک

ہیں بعض اوقات عیسائیوں کی یہ مذہبی دیوانگی ایک مرضِ متعدی کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ مسلمان حکمرانوں نے جس معقول اور خاموش طریق پر اس دیوانگی کا علاج کیا وہ تاریخ اسلام کا ایک شان دار کارنامہ ہے۔ چونکہ مجھے کسی آیندہ خطبے میں اسلامی رواداری پر مفصل عرض کرنا ہے۔ اس لئے فی الحال دہاشا کی کتاب "عربی ہسپانیہ" سے ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں :-

"مسلمانوں کے کسی دوسرے دَور کی نسبت نویں صدی کے وسط میں چرچ سے متعلق ہماری معلومات زیادہ وسیع ہونے کی وجہ مذہبی جنون کی وہ وبا ہے جو قرطبہ میں اس زمانہ میں نمودار ہوئی۔ عیسائیوں کو مسجدوں میں داخل ہونے اور رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی توہین کی ممانعت تھی اور اس جرم کی سزا قبولِ اسلام یا موت تھی۔ فلادنر (ایک ہسپانوی مصنّف) کہتا ہے "یہ شہیدوں کا ایک ہولناک جرم تھا اور اگرچہ وہ اس کے ارتکاب سے بخیال خویش اپنے مذہب کا مرتبہ بلند کر دیتے تھے۔ لیکن مسلم قاضی پورے ضبط و تحمل سے کام لیتے اور ان مذہبی دیوانوں کی زبان سے رسولِ خدا صلعم اور اُن کے پیرووں

کی تذلیل اپنے کانوں سے سن لینے کے بعد فیصلہ صادر کرتے تھے۔" ایک اور تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے دو "شہید" قرطبہ کی جامع مسجد میں داخل ہوئے اور نہ صرف اپنے مذہب کی تلقین شروع کی بلکہ "محمدؐ کے جھوٹے ہونے اور اُس کے ماننے والوں کو جہنم میں گھسیٹ لے جانے پر" (نعوذ باللہ) بھی وعظ کہنا شروع کیا۔ ایسے جرم کے ارتکاب کے بعد اگر یہ معلوم ہو کہ عیسائیت کے یہ مجنون مبلغ اپنی جانیں کھو بیٹھے تو ہمارے لئے مقام تعجب نہیں ہو سکتا۔ مسلمان حکمرانوں اور معقول عیسائیوں نے بھی ان مذہبی دیوانوں کو اس طرح کی ہلاکت سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس معاملہ میں بشپ رکفرڈ کی کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں۔ اُس نے عیسائیوں کو اس طرح شہادت کا درجہ حاصل کرنے سے منع کیا۔ کیونکہ مسلمان اُن کو تبدیل مذہب پر مجبور نہ کر رہے تھے۔ اس بشپ نے ایسے عیسائیوں کو جو اُس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے تھے سزائے قید بھی دی۔ عبدالرحمٰن دوم نے اُسے اُندلس کا اسقف اعظم مقرر کیا تاکہ وہ قرطبہ میں بھی اپنا شائستہ اثر پھیلا سکے۔ وہاں بھی رکفرڈ نے بہت سے عیسائیوں کو

یہاں تک کہ قرطبہ کے بشپ کو بھی قید میں ڈال دیا تاکہ اس شرارت کا انسداد ہو سکے ۔"

اس قسم کی مذہبی دیوانگی کی مثالیں ایشیائی ممالک کی تاریخ میں اور بھی ملتی ہیں جہاں مسلمانوں نے اس اشتعال کو اور بھی زیادہ صبر و تحمل سے برداشت کیا۔ مسلمانوں نے مشرق و مغرب میں عیسائیوں سے بالعموم زیادہ سے زیادہ رواداری برتی ہے۔ مشہور پارسی مستشرق جی، کے نریمان نے اپنے انکشافات علمیہ سے ثابت کیا ہے کہ عربوں کے ہاتھوں ایران میں زردشتیوں کے قتل اور وہاں سے اُن کے فرار کا افسانہ تاریخی حیثیت سے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ زردشتی آج تک ایران میں موجود ہیں۔ شام میں عیسائی خلفائے راشدین اور بنی اُمیہ کے عہدِ حکومت کو اسلامی فیاضی کا دَورِ زرّیں کہہ کر یاد کرتے ہیں تو مجھے ذرا تعجب ہُوا کرتا ہے کیونکہ اس خاندان کے چند خلفاءؑ کا دامن اُن دردناک مظالم سے داغ دار ہے جن پر اُن کے عروج کی بنیادیں استوار کی گئیں۔

لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ تاریخی طور پر اسلام بنی اُمیہ کا بہت کچھ مرہونِ منت ہے۔ انہوں نے اسلام کی سادہ اور

معقول و پسندیدہ عربی نوعیت کو قائم رکھا اُنہوں نے دمشق میں
داعی اور رعایا کے درمیان مروّت و یگانگت کے وہی تعلقات
قائم رکھے جو خلافتِ مدینہ کا طرۂ امتیاز تھے۔ ان کے عہدِ
حکومت میں خلیفہ خود منبر پر کھڑے ہو کر جمعہ کا خطبہ دیا کرتا تھا۔
کتاب الغرزی میں اس خاندان کے ایک نہایت ہی روشن دماغ
خلیفہ کی پریشانیاں اور مشکلات ایک چھوٹی سی کہانی میں یوں
بیان کی گئی ہیں "کسی نے عبدالملک سے دریافت کیا آپ کے
بال قبل از وقت کیوں سفید ہو گئے ہیں تو خلیفہ نے فرمایا" مجھے
منبر پر کھڑے ہوئے عربی میں غلطی کر جانے کے خوف نے بڈھا
کر دیا ہے "کیونکہ اُن کے نزدیک عربی میں غلطی کرنا ایک
حد درجہ ہولناک امر تھا" خلفاءِ راشدین کے بعد دوسرا مرتبہ
امیر ابن عبداللہ کو حاصل ہے۔ وہ بھی خاندان بنی اُمیّہ ہی کے
چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان کی تباہی و ہلاکت کے بعد مغرب
کی طرف بھاگا اور ایک ایسے خاندان کی بنا ڈالی جس نے ہسپانیہ
کو مدتوں مغرب کے لئے علم و ترقی کا علمبردار بنا کے رکھا۔

تاریخ کے طالب علم کو یہ امر ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بنو
عباس کی خلافت بنو اُمیّہ کی سنیت اور فاطمیوں کی شیعیت

کے درمیان ایک مفاہمت کی صورت تھی بنی اُمیہ کے لئے تو عباسی بھی شیعہ ہی تھے۔ جب آپ ہسپانیہ کی تاریخ میں شیعوں کا تذکرہ دیکھیں تو یاد رکھیں وہ لوگ ایسے نہ تھے جن کو ہم شیعہ کہتے ہیں بلکہ وہ وہ لوگ تھے جنہیں ہم سُنّی سمجھتے ہیں وہ بنی العباس کے مقلد اور بنی اُمیہ کے مخالف تھے۔ یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ بنی العباس کی خلافت ایک نہیں دو فریب کاریوں پر استوار ہوئی۔ ایک طرف تو اُنھوں نے اہلِ بیت کو یقین دلایا کہ وہ اُن میں سے ایک کو تختِ خلافت پیش کریں گے دوسری طرف بہت سے سرگرم سنّیوں کو جو اب تک بنی اُمیہ کے مؤید لیکن موروثی خلافت کے مخالف تھے۔ یقین دلایا کہ وہ ایسے مسلمانوں میں سے جو اپنی خدماتِ ملی کے لئے ممتاز رہے ہوں انتخاب خلیفہ کے اصول کو ازسرِ نو زندہ کریں گے۔ اُنھوں نے دونوں میں سے کوئی ایک وعدہ بھی پورا نہ کیا۔ بلکہ خود ہی ایک خاندان کے بانی بنے اور بنی اُمیہ کے خاندان کے افراد کو سوائے ایک کے جو ہسپانیہ بھاگ گیا نہ تیغ کر دیا کیونکہ اس خاندان کو شام، نجد، مصر اور شمالی افریقہ میں ہر دلعزیزی حاصل تھی اور اس خاندان کا ہر فرد زبردست حریف

بن سکتا تھا۔ اور اہلِ بیت کی تو اُنھوں نے اُن کے مستقل حق خلافت کی بنا پر ایذا رسانی شروع کی۔ ان دو فریقوں کی لڑائی کو مذہبی اختلافات پر محمول کرنا غلطی ہے وہ تو شمالی اور جنوبی عرب کے قبائل کا ایک جھگڑا تھا جو ایّام جاہلیّت سے چلا آتا تھا۔

اسلامی حکومت کی سادگی بنی اُمیّہ کے آخری فرد کے ساتھ ہسپانیہ میں منتقل ہو گئی۔ مشرق کی خلافت بنی العباس کے حصّہ میں آئی جس پر پہلے ہی ایرانی رنگ غالب تھا۔ پایۂ تخت شام سے عراق منتقل ہو گیا اور اس طرح وہ بغداد معرضِ ظہور میں آیا جو موجودہ بغداد سے حد درجہ مختلف جو اپنی عمارات کی خوبصورتی اور ترتیب و آراستگی حفظانِ صحت کے اہتمام کی عمدگی، پولیس کے حسنِ انتظام اور سڑکوں کی روشنی کے لحاظ سے ایک عدیم النظیر شہر تھا۔ بغداد میں اور سلطنت کی تمام حدود کے اندر آیندہ تین صدیوں میں تہذیبِ اسلامی اپنی انتہا تک پہنچ گئی لیکن ہسپانیہ کے سوائے ہر جگہ ایرانی طمطراق نے عربی سادگی کا خاتمہ کر دیا۔ بقول ایک مشہور مغربی مصنّف کے "تاریخ عالم کے اس عہد میں قرطبہ، قاہرہ، بغداد اور دمشق ہی وہ شہر تھے

جن میں سڑکوں اور گلیوں میں روشنی کا انتظام اور پولیس کا اہتمام میسّر تھا" وہ احترام اور طرزِ خطاب جو خلفائے راشدین اور بنی اُمیّہ کافرانہ سمجھ کر رد کر دیتے تھے خلفاً بنی العباس نے پہلے اختیار اور بعد میں اس پر اصرار کیا۔

اسی زمانہ میں حرم سرائے کا رواج ہُوا اور عورت نے سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ میں ایک شاطر اور سازشی قیدی کی حیثیت حاصل کی اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں عورت کو جو شریفانہ اور آزادانہ حیثیت حاصل تھی اُس کا خاتمہ ہو گیا۔

اسلام کی وسعت و عالمگیری کو ایک فرقہ کے اندر ہی محدود کر دینے کا میلان بھی ظاہر ہُوا جس کے کامیاب مقابلہ کے لئے معقولیت پسند مسلمان علماً و فضلاً میدان میں اُتر آئے۔ خلیفہ نے تو اس رجحان کو پسند کیا کیونکہ اس طرح اُسے وہ حیثیت میسّر آتی تھی جو اُس کی حقیقی اسلامی حیثیت سے بہت بڑھ چڑھ کر تھی۔

مسلسل فارغ البالی کے طویل دَور نے عوام کو جنگی ضروریات کے لحاظ سے بیکار کر دیا تھا۔ بلاشبہ اس سلطنت کی وسیع حدود میں چھوٹی موٹی لڑائیاں بھی ہوتی رہیں لیکن جیسا کہ میں اسلامی

ضابطہ جنگ کی بحث میں عرض کروں گا عوام پر ایسی لڑائیوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اُن اہلِ بصیرت مسلمانوں نے جنہیں فہمِ قرآن کی نعمت میسّر تھی۔ اس صورتِ حال کو ناقابلِ اطمینان پاتے ہوئے لوگوں کو خطرات سے خبردار بھی کیا۔ لیکن علماؑ نے جو علم و فضیلت کے ایک گونہ سرکاری اجارہ دار بنے بیٹھے تھے۔ خلیفہ کی ناروا خوشامد و تائید سے اُسے ایک معصومیت کے وہمِ باطل میں مبتلا کر دیا۔ اُنہوں نے اس خیال و اعتقاد کی تلقین کی کہ خلیفہ خدا کا منظورِ نظر ہے۔ وہ اللہ کے حفظ و امان میں ہے اور اُس کی سلطنت کی شان و شوکت ابد تک برقرار رہے گی۔ سرحدوں کی حفاظت جنگجو قبائل خاص کر ترکوں کے سپرد کر دی گئی اور وہی خلیفہ کے ذاتی محافظ بھی مقرر ہوئے۔ یہ لوگ اپنے برائے نام حکمرانوں کی محافظت کی منزل سے نکل کر اُن پر پورا پورا قابو پا گئے۔ یہ قبائل نہایت سمجھ دار، سادگی پسند اور طاقت و قوت سے معمور تھے۔ اُنہوں نے مامون اور ہارون الرشید کے تخت پر بیٹھنے والے عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے کمزور اور ڈرپوک شاہزادوں کے خلاف اپنے جذبۂ نفرت و حقارت کو کبھی چھپائے نہ رکھا۔ انہوں نے

یکے بعد دیگرے ان شہزادوں کو انتہائی ذلّت کے ساتھ کبھی قتل اور کبھی معزول کیا۔ ان لوگوں کی بدولت اس گرتی ہوئی سلطنت میں جو اُن کے بغیر دم توڑ دیتی زندگی کا ایک نیا ولولہ پیدا ہوا۔ اُنھوں نے سلطنت کے مرکزی صوبجات کے انتظام کی خوبی کو بھی قائم رکھا۔ اگرچہ اُس وقت دُور دراز ولایات پر خلیفہ کا اقتدار محض برائے نام تھا لیکن مسلمانوں کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے وہ مقامی عمال کے تقرر کی تصدیق ضرور کیا کرتا تھا اور عوام کے لئے یہ تقریب ایک مذہبی حیثیت رکھتی تھی۔ ایران نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مصر کو ایک ایسے خاندان نے فتح کر لیا جو فاطمی یعنی اولادِ رسولؐ سے تھے۔ اگرچہ اس زمانہ کے سنیوں نے اُن کا یہ دعویٰ تسلیم نہ کیا اور اُنہیں ایک کربلائی یہودی کی اولاد بتلایا۔ اس خاندان نے ایک جداگانہ خلافت قائم کر لی اور فلسطین و شام کو دو مرتبہ اور حجاز کو ایک مرتبہ فتح بھی کر لیا۔

خلافت عباسیہ کی مدّت یوں تو پورے پانچ سو سال ہے لیکن آخری ساڑھے تین سو سال کی برائے نام مدّت میں حقیقی قوت ترکوں کے ہاتھ آ چکی تھی۔ اس سلطنت کا سیاسی وقار ترکی

امیروں - پہلے سلجوقیوں یعنی طغرل بیگ - الپ ارسلان اور ملک شاہ ، پھر زنگیوں یعنی عماد الدین اور نور الدین پھر ایوبیوں یعنی صلاح الدین ، ملک عادل اور ملک کامل وغیرہ سے وابستہ رہا۔ حکمرانوں میں تبدیلی ضرور ہوئی لیکن ڈنکا عباسیوں ہی کی تہذیب کا بجتا رہا۔ اس میں اگر کوئی تنزّل رونما بھی ہوا تو وہ نہایت خفیف تھا اور اسلامی سلطنت کے اطراف و اکناف میں عوام کی حالت بہ لحاظ تعلیم ، حفظانِ صحت ، امن عامہ اور آزادی اُس زمانہ میں ہر قوم سے بہتر تھی۔

اس زمانہ کی اسلامی سلطنت کی مالی خوش حالی مغربی دُنیا کے لئے قابلِ رشک تھی اور مغربی سوداگروں کی کمپنیاں اسلامی دُنیا میں تجارت کی اجازت حاصل کرنے کے لئے باہم خوب مقابلہ کیا کرتی تھیں۔ مسلمانوں کی اُس زمانہ کی مرفہ الحالی کا ایک معمولی سا اندازہ زمانہ حال کے ایک انگریز مصنّف کے ایک اقتباس سے ہو سکتا ہے اور یہ یاد رہے کہ یہ مصنّف مسلمانوں کا کوئی خیر خواہ یا مدّاح نہیں۔

" ہسپانیہ کی خوش حالی کے باوجود جس کا آغاز سولھویں صدی میں نئی دُنیا کے ساتھ اُس کی عمدہ تجارتی حیثیت سے ہوا اس

کے مصنوعات اور ان کے ساتھ اس کی خوش حالی کیتھولک بادشاہوں کے عہد میں رو بہ انحطاط ہوگئی اور یہ انحطاط اس وقت مکمل ہوگیا جب فلپ ثالث کی طرف سے ازابل کی حمایت مذہب میں شروع کی ہوئی تباہی کی تکمیل ہسپانیہ سے آخری مسلمان کے اخراج سے عمل میں آئی"۔

غلامی

دوسرے ممالک میں تو کیا خود یورپ میں اُس زمانہ میں کاشتکار تو محض غلام تھے پیشہ وروں کا درجہ سوسائٹی میں نہایت حقیر تھا اور سوداگروں کو خوشامد اور شوکت کی بدولت بعض حقوق و امتیازات حاصل ہونا شروع ہوگئے تھے مگر اسلام کی سلطنت میں کاشتکار و دستکار بھی ہر طرح آزاد تھے لیکن مسلمانوں کے غلاموں کی غلامی پر تو کتنی ہی آزادیاں قربان کی جا سکتی ہیں کیونکہ آنحضرت صلعم کے ارشاد مبارک "غلاموں کو اپنے جیسا کھانا کھلاؤ اور اپنے جیسے ہی کپڑے پہناؤ۔ کیونکہ جو غلام نماز پڑھتے ہیں تمہارے بھائی ہیں" کی تعمیل لفظاً و معناً ہوتی تھی اور احکام الٰہی کی متابعت میں شکرانہ کی ہر تقریب پہ

اور بعض احکام شریعت کی خلاف ورزی کے کفارے کے طور پر غلاموں کو آزاد کیا جاتا تھا پس اگر مسلسل جنگوں سے مسلمانوں کو نجات مل جاتی اور غنیمت میں غلام ہاتھ نہ آتے تو اسلامی ممالک میں غلامی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا لیکن مسلسل اور موروثی غلامی کی تو کوئی صورت اسلامی ممالک میں نہ پائی جاتی تھی۔ غلام یا کنیز تو گھر کا بیٹا بیٹی تصور ہوتے تھے اور بے اولاد آقاؤں کے ہاں گھر کی جائداد کے وارث ہوتے تھے۔ اسی طریق پہ مسلمان بادشاہوں کے غلاموں نے سلطنتیں تک وراثت میں پائی ہیں۔ مسلمان جن کے ہاں کوئی بیٹا نہ ہوتا تھا اپنے غلام ہی سے اپنی بیٹی بیاہ دیتے اور اس طرح اپنے خاندان کی عزت و ناموس کی پاسبانی اُس کے سپُرد کر دیتے تھے غلام اور آقا کے تعلقات اس قدر خوشگوار تھے کہ مالکوں کی محبت اور غلاموں کی وفاداری ضرب المثل بن گئی۔ جب آخری زمانہ میں جنگ کی بدولت ہاتھ آنے والے غلاموں کی تعداد میں کمی ہو گئی اور غلاموں کی خریداری بعض خاص مقامات (کاکیشس) پر جہاں اس کا قدیم سے رواج چلا آتا تھا محدود کر دی گئی تو بہت سے مسلمانوں کو شکایت پیدا ہوئی کہ غلاموں کو آزاد

کرنے اور اُن سے حسنِ سلوک کے جو احکام قرآن میں
بہ تاکید موجود ہیں اُن کی تعمیل کی سعادت سے وہ غلاموں
کے میسّر نہ آنے کی بنا پر محروم ہوگئے ہیں لیکن اگر ایک
طرف یہ دلیل بغیر کسی انقلاب کے غلامی کی بیخ کنی کے
اسلامی مقصد سے قطعی نا واقفیت کی آئینہ دار ہے تو دوسری
طرف مقصدِ اسلام سے نا واقفیت کی انتہا آج بھی یہ ہے کہ
میں نے یہی دلیل خود اپنے کانوں سوڈان میں ظالمانہ غلامی
کے جواز میں پیش ہوتے سُنی ہے غلاموں کی تجارت ایک
ظلم نہیں ایک شقاوت و سفّاکی تھی جس کی اسلام میں کوئی
اجازت نہیں۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ تمام دنیائے اسلام میں
غلامی کے پردہ میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہو گی۔ لیکن میں اتنا
ضرور کہوں گا کہ اہلِ یورپ نے مسلمانوں میں غلامی کے
متعلق جو کچھ سمجھا اور کہا ہے وہ سراسر ایک دفترِ کذب و
افترا ہے جس طرح اسلامی اور عیسائی غلامی میں کوئی مشابہت
نہیں ٹھیک اسی طرح اسلامی غلامی کو امریکہ کے بڑے بڑے
باغات اور کاشت میں سرسبز ہونے والی غلامی سے دور کی
بھی نسبت نہیں۔

مساوات

اسلام کے گھرانے میں رنگ و نسل کا امتیاز کبھی نہیں رہا۔ اسلامی منڈیوں، مسجدوں اور محلّات میں کالے اور گورے مکمل مساوات پر اور دلی دوستی سے ملتے تھے۔ اسلام کے بعض مشہور بادشاہ اور اولیاؑ ایسے ہی سیاہ رنگ تھے جیسا کوئلہ مثلاً حبشی یمن کا عہدِ عباسیہ کا درویش بادشاہ اور مصر کا مشہور مورخ احمد الجبرتی جس نے محمد علی بانیٔ خاندان خدیویہ کا زمانہ پایا۔ اگر کسی شخص کے دل میں شبہ پیدا ہو کہ اسلام کے وسیع خاندان میں گورے چِٹے لوگ نہیں تھے تو اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اہلِ سرکیشیا اور اناطولیہ کے پہاڑی باشندوں کی رنگت جنہیں بہت ابتدا ہی سے اسلامی برادری میں شمولیت کا شرف حاصل ہُوا دُنیا بھر کے گوروں کو شرماتی ہے۔ اسلام کی تہذیب میں دولت اور مرتبے کا فرق نہ تھا لیکن اس تفاوت کو مغرب کے موجودہ جماعتی تفاوت یا ہندوستان کی ذات پات کی تمیز سے دُور کی بھی کوئی مشابہت نہ تھی۔

صفائی

اسلامی تہذیب کا ایک امتیاز اُس زمانہ میں اُس کی طہارت۔ پاکیزگی۔ صفائی اور نفاست پسندی تھا جب یورپ ہر طرح کی گندگی و آلودگی میں تقدّس کی جستجو کرتا تھا ہر شہر میں نہانے کو حمام اور پانی پینے اور کپڑے دھونے کے لئے سرکاری چشمے موجود تھے۔ مسلمان جہاں کہیں پہنچا اُس نے پاکیزہ اور مصفّا پانی کی بہم رسانی پر سب سے پہلے توجہ کی۔ مسلمان اور نہانے دھونے کی کثرت اور اسلام کچھ اس طرح باہم وابستہ ہوئے کہ اندلس میں ۱۵۶۶ء میں حمام کا استعمال مستوجب سزا قرار پایا کیونکہ اس طرح لوگوں کے دلوں میں اسلام کی یاد تازہ رہتی تھی۔ سیبولی کے ایک مالی کو اپنے کام کے دوران میں نہانے پر شدید سزا دی گئی۔ میں نے خود اناطولیہ میں ایک یونانی عیسائی کو دوسرے کی نسبت کہتے سُنا "یہ تو نیم مسلمان ہے۔ اپنے پاؤں بھی دھوتا ہے۔" بازار میں فروخت ہونے والی اشیائے خوردنی اور ذخائر تمام اسلامی شہروں میں سرکاری نگرانی کے ماتحت تھے۔ گوشت اور دوسری

تمام ضرر پذیر اشیأ خوردنی گرد و غبار اور مکھیوں سے بچانے کے لئے حکماً کپڑے سے ڈھکی رہتی تھیں۔

سوسائٹی کے مختلف طبقات میں باہم میل ملاپ نشست و برخاست اور شادی عام تھی۔ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں ایک آنکھوں دیکھی کیفیت و حقیقت ہے۔ کیونکہ جب مجھے پہلے پہل مصر، شام اور اناطولیہ کی سیاحت کا اتفاق ہؤا تو وُہ تہذیب تمام اہم اعتبارات سے وہاں زندہ موجود تھی۔ جب میں الف لیلہ پڑھتا ہوں جس کی بہت سی کہانیاں خلافتِ عباسیہ سے متعلق ہیں۔ اگرچہ اس کی جمع و اشاعت کا کام چند صدیوں بعد مصر میں انجام پایا تو میری آنکھوں کے سامنے دمشق، یروشلم حلب، قاہرہ اور دوسرے اسلامی ممالک کا وہ نقشہ پھر جاتا ہے جو میں نے اپنی سیاحت کے دَوران میں گزشتہ صدی کے عشرۂ آخر میں پایا۔ میں نے اس تہذیب کی ایک دھندلی سی جھلک تو ضرور دیکھی ہے ان اسلامی ممالک میں مَیں نے تنزّل و غربت میں زندگی کا وُہ لطف موجود پایا جو مغرب میں ترقی اور دولت کی فراوانی کے باوجود کمیاب ہی نہیں نایاب ہے وہ لوگ زندگی کے افکار و آلام سے آزاد تھے نہ

ہماری طرح دولت کی پرستش اُن کا شیوہ اور نہ موت ہی کا ڈر اُن کی جانوں کو کھائے اور روحوں کو گھلائے جاتا تھا۔ اُن کی باہمی مروّت اور خیرات و سخاوت کا تو کیا کہنا مسلمانوں کی سلطنت میں کسی شخص کا پڑوسی بھوک اور موسم کی اذیت سے ہلاک نہ ہوتا تھا اُن لوگوں کے پاس کچھ ایسی دولت ضرور تھی جس سے یورپ کا دامن خالی ہے۔ بلاشبہ اُن کے پاس تمدّن کا وہ سازوسامان نہ تھا جس کی بے پناہ کثرت پر مغرب کو ناز ہے ایک مدت کے بعد مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہُوا کہ کسی زمانہ میں یورپ کی موجودہ مرفہ الحالی کے ساتھ اُن کے ہاں وہ باطنی راحت اور روحانی مسرّت بھی جمع تھی جس پر مجھے رشک آتا تھا سالہا سال کے مطالعہ اور قریباً بیس سال کے غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ نصف شریعت کے احکام کو فراموش کر دینے کی پاداش میں مادی مرفہ الحالی سے تو محروم ہو چکے ہیں وہ اطمینانِ قلب اور وہ باطنی اور روحانی مسرّت آج بھی ہر اُس شخص کے حصّہ میں آ سکتی ہے جو اُن کی طرح بقیہ نصف شریعت پر عامل ہو۔

اسبابِ تنزّل

اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں تہذیب اسلامی کے تنزّل کے اسباب سے بحث کروں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ تہذیب اسلامی خلافتِ عباسیہ کے انحطاط کے بعد ترکی غلاموں کی جواں ہمتی سے زندہ رہی۔ ترک جب خلیفہ کی ملازمت میں شامل ہوئے تو اُن کی حیثیت غلاموں سے زیادہ نہ تھی لیکن اُن کے سرداروں نے جلد ہی امیرالامرا اور بعد میں سلطان اور ملک کے خطابات حاصل کر لئے۔ دُنیا متعجب ہے کہ کس طرح تہذیب اسلامی کی عنان اختیار ایک مہذّب قوم کے ہاتھ سے نکل کر مقابلۃً ایک وحشی قوم کے ہاتھ میں منتقل ہو جانے کے باوجود یہ تہذیب صدیوں نہ صرف قائم و بحال رہی بلکہ ترقی کرتی گئی۔ لیکن یہ تعجب لاعلمی پر مبنی ہے۔ ہماری حیرت رفع ہو جاتی ہے جب ہم یہ جان لیتے ہیں کہ یہ نیم وحشی پکّے مسلمان تھے۔ اگر وہ کسی وقت خلیفہ کی کھلی ہوئی بے حرمتی کا ارتکاب کرتے تھے تو اُن کا مقصد منصب خلافت کی توہین نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو صرف اُس

ناکارہ و بدکار انسان سے بدسلوکی کرتے تھے جس کا وجود
اور عمل ملتِ اسلامیہ کی مجسم تذلیل اور سلطنتِ اسلامیہ کے لئے
باعثِ ننگ و عار تھا۔ علامہ ابن خلدون نے اپنے شہرۂ آفاق
"مقدمہ" میں ایک شعر نقل کیا ہے جس کے معنے ہیں کہ
"خلیفہ ایک غلام لڑکے اور ایک عورت کے ہاتھ میں گویا پنجرے
کا طوطا ہے جو کچھ اُسے پڑھایا جاتا ہے وہی دُہراتا ہے"۔
خلیفہ اور خلافت ایک چیز نہ تھے خلیفہ کی بد اعمالیوں اور
سیہ کاریوں کے باوجود منصب خلافت کی اہمیت ہر
مسلمان بالخصوص سادہ لوح ترکی سپاہی کے نزدیک مسلّم و
محترم تھی۔ تہذیب اسلامی کا ایک دوسرا محافظ علمأ اسلام
کا اجماع تھا جس کا ترکی نگران حد درجہ احترام کرتے تھے۔
حسبِ ضرورت دُنیائے اسلام کی پچاس یونیورسٹیوں کے
مندوبین ایک کونسل کی صورت میں جمع ہو جاتے تھے آج
کل کے زمانہ کی طرح اُس وقت کے علمأ صرف نام کے
علمأ ہی نہ ہوتے تھے حقیقت میں اُن کا لقب فقہأ ہونا
چاہیئے۔ لیکن چونکہ فقہ اُس وقت خود ایک ابتدائی حالت
میں تھی وہ علمأ ہی کہلاتے تھے۔

اسلامی یونیورسٹیاں

اُس زمانے کی اسلامی یونیورسٹیاں دنیائے علم واکتشاف کی مسلمہ رہنما تھیں۔ اسلامی یونیورسٹیوں کا نصاب تعلیم ہر قسم کے علوم پر مشتمل تھا۔ ان یونیورسٹیوں نے اُس زمانہ کے حالات کے مطابق اشاعت علوم اور علوم پروری کو حد کمال تک پہنچا دیا۔ بلا شبہ اُس زمانہ کے حالات اور مشکلات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ یونیورسٹیاں آج کل کی سی ترقی کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی تھیں لیکن اس قدر مسلّم ہے کہ اسلامی یونیورسٹیاں بلا خوف تردید اپنے زمانہ کی بے نظیر درسگاہیں اور ایسے روشن ترین ادارات تھے جن کا تعلق مذہب سے تھا۔

جرمن پروفیسر جوزف ہیل اپنی مختصر تصنیف "تہذیب عرب" میں جس کا تھوڑا عرصہ ہوا خدا بخش صاحب نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے ان یونیورسٹیوں کے متعلق یوں رقم طراز ہیں :-

" ان یونیورسٹیوں میں مذہب کو سب سے بڑا مرتبہ حاصل تھا کیونکہ مذہب ہی نے پہلے پہل اکتساب علوم کی راہیں

کھول دی تھیں ۔معارف قرآن ۔ علوم حدیث اور فقہ کو ان درسگاہوں میں ایک شانِ امتیازی حاصل تھی لیکن یہ اسلام ہی کا کارنامہ ہے اور یہ فخر مسلمانوں ہی کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ اسلامی یونیورسٹیوں نے دوسرے دنیوی علوم کو حقارت سے نہ دیکھا اور نہ انہیں ناقابلِ التفات قرار دے کر رَد کر دیا۔ بلکہ اسلام نے ان علوم کو اپنی مقدّس درسگاہوں یعنی مسجدوں میں جو دینیات کے لئے مخصوص تھیں جگہ دی پانچویں صدی ہجری تک اسلام کی یونیورسٹی مسجد ہی کے اندر تھی۔ اور اسلام میں تعلیم دینے کی قطعی آزادی کا یہی ایک سبب تھا۔ اُستاد پر امتحان پاس کرنے یا سند اور سرٹیفکیٹ پیش کرنے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ جب کوئی شخص کسی مضمون میں فضیلت حاصل کر لیتا تو وہ درس دینے کا اہل شمار ہوتا تھا "

اس کے بعد پروفیسر ہیل بیان کرتے ہیں کہ کس طرح معلمین کے درس میں عالم فاضل لوگ بھی معمولی طالب علموں کے ساتھ شریک ہوتے تھے ۔ بحث مباحثہ کی پوری آزادی تھی۔ کوئی شخص جو اپنے بیان کی تائید میں دلائل وشواہد نہ

پیش کر سکتا یا شاگردوں کی پُر زور تنقید کا معقول وقطعی جواب نہ دے سکتا تھا مسجد میں ایک ہی درس کی تکمیل سے پہلے پہلے اس منصب بلند سے دست بردار ہو جاتا تھا۔

اُس زمانہ کی اسلامی یونیورسٹیوں کے اُستاد علم وفن میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اور اُنہی مسلمان معلمین کے ذوق و فیض کی بدولت آج مغرب ایک گہوارۂ علم و فن بنا بیٹھا ہے۔ اُن اُستادوں میں جو ماہر کیمیا تھا اُس نے علم کیمیا میں سُنی سُنائی باتوں اور زورِ بیان کو ناقابلِ قبول قرار دیا۔ اُس نے اس امر کو مسلّمات میں سے قرار دیا کہ جب تک کسی امر کی تائید میں دلائل پیش نہ کئے جا سکیں اُس کی صحت قابلِ قبول نہیں۔ جب کوئی شخص اپنے دعوےٰ کا ثبوت پیش کرتا ہے تو ہم اُس کا دعویٰ درست مانتے ہیں۔"

اُس زمانہ کے علمأ مذہبی مجنون یا گم کردہ راہ رہنما نہ تھے۔ اُن یونیورسٹیوں کے اساتذہ اپنے زمانہ کے نہایت ہی منور الفکر اور روشن دماغ بزرگ تھے۔ آنحضرت صلعم کی تعلیمات اقدس کی متابعت اور مطابقت میں یہی لوگ عوام کی آسائش و آسودگی کے نگراں تھے اور یہی لوگ قرآن حکیم

کے عطا کئے ہوئے حقوق انسانی سے انحراف و غفلت کی صورت میں خلیفہ کو ٹوک دیتے تھے۔ اسلامی یونیورسٹی کے اساتذہ اور علماٗ ہی جنون مذہبی کو سر اُٹھانے نہ دیتے تھے۔ مذہبی اختلاف آراٗ کی صورت میں ظلم و تعزیر کی خواہش کو دبا دیتے اور دوسرے سینکڑوں طریقوں سے اسلامی تہذیب کو انحطاط سے بچاتے تھے۔ اُنہوں نے ایسے اسلامی تاجداروں کو جو غیر اسلامی جنگوں کو اپنی کشور کشائی کا ذریعہ بناتے تھے۔ مسلمان عوام کو اپنی اعانت کے لئے بلانے سے روکا۔ یہ علماٗ ایسے بادشاہوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ صرف اپنے زر خرید غلاموں کی مدد سے جنگ کریں اور اسلامی ضابطہ جنگ کی متابعت میں دشمنوں کے کھیتوں کو برباد اور مویشی کو ہلاک نہ کریں اور نہ ہی اُن لوگوں سے کوئی تعرض کریں جو اُن کے خلاف جنگ میں حصّہ نہ لے رہے ہوں۔ عوام پر ان علماٗ کا اس قدر گہرا اثر تھا کہ وہ اُن بادشاہوں تک کو جو شریعت کی خلاف ورزی کی جرأت کرتے تھے سزا دیتے اُن سے کفارہ دلواتے اور انہیں توبہ پہ مجبور کرتے تھے۔

چنگیز خاں کے ہلاکت آفریں طوفان نے جہاں ان میں سے اکثر عظیم الشان درس گاہوں کو پیوند خاک کر دیا وہاں اکابر علماء کو بھی موت کی نیند سُلا دیا۔ یہ المناک واقعہ اُس وقت پیش آیا جب ترکی حکمرانوں کا لشکر افواج صلیبی کے مقابلہ کے لئے مغرب کی طرف منتقل ہو چکا تھا اور سلطنت کی مشرقی حدود کی حفاظت کا اہتمام کمزور ہو چکا تھا۔ سرحد عبور کر چکنے کے بعد موت و خون کے اس سیلاب کے لئے کوئی روک موجود نہ تھی۔ اس سیلاب بلا کی تباہی نے مسلمانوں کو یاد دلا دیا کہ انہوں نے عالمگیر عسکری تربیت مہیا نہ کرنے میں شریعت کے ایک کھلے ہوئے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس احساس کی شدت نے عوام کے دلوں میں اس قدر محکم جگہ حاصل کر لی کہ ہر مسلمان کی عسکری تربیت کی ضرورت ایک فریضہ مذہبی سمجھا جاتا رہا اور یہ احساس کل تک غالب رہا جب ہماری آنکھوں کے سامنے یورپ نے اسلامی سلطنتوں کو پارہ پارہ کر دیا۔

سلطنت اسلامی چنگیز خاں کے حملہ کے بعد پھر زندہ ہوئی اور اُس نے ترقی کی اور یہاں تک ترقی کی کہ یورپ اُس کے

خوف سے پھر ایک مرتبہ لرزہ بر اندام ہو گیا۔ یورپ کے اس خوف نے پرانی صلیبی عداوتوں کو نئی صورتوں میں زندہ کیا اور اس طرح زوال اسلام کا ایک ثانوی سبب مہیا کر دیا۔ میں نے یورپ کی اسلام دشمنی کو انحطاط عالم اسلام کا ایک ثانوی سبب قرار دیا ہے کیونکہ مسلمانوں کے انحطاط کے بنیادی سبب کی تلاش تو شریعت یعنی اُن قوانین فطرت میں ہی کرنی چاہیئے جو اقوام و ملل کے عروج و زوال کے شارح ہیں۔

علماء کی تنگ نظری

مسلمانوں کی سلطنت اس زمانہ میں ترقی تو بلاشبہ ضرور کر رہی تھی لیکن اس ترقی کا موجب وہ طاقت و قوت تھی جو اُسے ایک زمانہ گذشتہ میں حاصل ہو چکی تھی۔ ایسے علماء جن کا عمل، علم حاصل کرو خواہ چین ہی میں ملے، پر تھا اب ناپید ہو چکے تھے۔ ان علمائے کرام کی مسند پر اب ایسے لوگ مسلّط ہو چکے تھے جو اس پرُشکوہ لقب کے طالب اور اُس احترام کے خواہاں تو ضرور تھے لیکن فریضۂ تلاش علم کو وہ اُسی اسلام کے اندر ہی

مقید سمجھتے تھے جس کا ایک محدود تصور اُنھوں نے قائم کر رکھا تھا۔ اُن کی فکر و نظر کی کوتاہیوں و نارسائیوں نے اُس عالمگیر حریت بخش اور ہدایت آموز مذہب اسلام کو ایک ایسا تنگ و محدود مذہب بنا دیا جیسا ہر وہ مذہب لازماً بن جاتا ہے جو انسان اور خدا کے درمیان کسی دوسرے انسان کو بطور واسطہ یا حدِ فاصل تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ اسلام جس نے دُنیا کو آزادیٔ فکر عطا کی وہ اسلام جس نے پادریوں - پروہتوں اور کاہنوں کی غلامی سے جو خدا اور انسان کے درمیان ایک ناروا روک بنے بیٹھے تھے۔ بنی نوع انسان کو نجات دلائی۔ وہ اسلام جس کی رحمت نے انسان کو انسان کی غلامی سے ہمیشہ کے لئے آزاد کرا دیا۔ خدا ہمارے گناہ معاف فرمائے ایسے برخود غلط علمأ کی فضیلت کا شکار ہو چکا تھا۔ طبعیات کا ذوق تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا ان بزرگوں نے تمام اُن علوم کو جو غیر مسلموں سے حاصل کئے جا سکتے تھے۔ کافرانہ علوم قرار دے کر اُن کے حصول سے مسلمان کو متنفر کر دیا۔ حالانکہ پہلے مسلمانوں کا عمل علم کی تلاش میں خواہ وہ کافروں کا علم ہی کیوں نہ ہو چین تک سفر کرنے پر تھا۔ اس آئین جہالت

اور علم دشمنی کے ساتھ ساتھ اُن کا غرور و تکبّر اور اُن کی خود بینی و خود رائی بڑھتی گئی۔

وُہ عیسائی اقوام جنہوں نے مسلمانوں کے ذوق کی پیروی میں سائنس کا مطالعہ شروع کیا مادّی ترقیات کے میدان میں اسی طرح دُور نکل گئیں جس طرح اُس زمانہ میں مسلمان مادّی ترقیات میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ جب اُنہوں نے شریعت کے اُس حصّہ پر عمل کیا جو آزادیٔ فکر کا اعلان عام کرتا اور حصول علم اور کائنات کی تخلیق کے مطالعہ کی ترغیب دیتا ہے۔ عیسائی اقوام نے اس زمانہ میں پادریوں اور تنگ نظر مذہب پرستوں کا جوّا اپنی گردن سے اُتار پھینکا اور آزادیٔ خیال کی نعمت سے بہرہ ور ہوئیں تو اُن کی مادّی ترقیات ایسی ہی حیرت انگیز تھیں جیسے پہلے مسلمانوں کی فتوحات اپنی شان و عالمگیری کے لحاظ سے۔

علما کی شانِ حق گوئی

میں اس سلسلہ میں اپنی رائے پیش کرنے سے پیشتر اسلام کے عالمگیر تخیل سے متعلق ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جو

اُس زمانہ سے متعلق ہے جو اسلامی تاریخ میں دَورِ ظلمت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا تذکرہ کتاب الفخری کے باب اوّل میں موجود ہے جہاں مصنّف شریعت اسلامیہ کی روسے حاکم میں وصف انصاف کی اہمیت سے بحث کرتا ہُوا یوں رقم طراز ہے کہ "جب سلطان ہلاکو نے بغداد پہ قبضہ کر لیا اور بیکار و بے بس عباسی خلیفہ کی زندگی اُس کے رحم وکرم پہ موقوف تھی۔ ہلاکو کے حکم پہ تمام علمأ مستنصریہ میں جمع ہوئے ہلاکو نے ایک سوال پیش کیا جس کا جواب علمأ کے ایک فتوے کی صورت میں ہونا تھا اور جس کے جواب پر خلافت کی قسمت کا فیصلہ منحصر تھا۔ سوال تھا کہ "از روئے شریعت ایک نا انصاف مسلمان حکمراں بہتر ہے یا ایک کافر مگر عادل حکمراں"۔

علمار حیران تھے کہ کیا جواب دیں۔ رضار الدین علی ابن طاؤس جو اپنے زمانہ کے شہرۂ آفاق عالم تھے اُٹھے اور سوال کے پرچے پر جواب لکھا "کافر مگر عادل سلطان" اور اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔ دوسرے تمام علمأ نے یکے بعد دیگرے اسی جواب پر مُہر تصدیق ثبت کی۔ سبھی کو اعتراف تھا کہ

درست جواب یہی ہے جب اللہ کے رسولؐ نے اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ اللہ کے ہاں سب ایک ہی پیمانے سے ماپے جائیں گے تو مسلمان مومن و کافر کے لئے علیحدہ علیحدہ معیار کیونکر روا رکھ سکتا تھا۔ خدا کا پیمانہ اور اُس کا فیصلہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ایک ہی ہے۔ کسی خاص فرقہ یا قوم سے اُسے کوئی خاص محبت نہیں۔ اللہ کے مخصوص بندے وہ ہیں، کوئی ہوں، کہیں ہوں، جو قوانینِ الٰہی پر کار بند ہیں۔ مخصوص شعائر کی پابندی یا مخصوص معتقدات معیار نہیں ہیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی منتر کی طرح دہرائی یا عمل میں لائی جا سکے اور جس کی بنا پر انسان کے گناہ دُھل جاتے ہوں۔ معیار عمل ہے۔ فرد و قوم دونوں کے لئے نیک اعمال کا نتیجہ اچھا اور بُرے اعمال کا نتیجہ بُرا ہے۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے اور اس تعلیم کی راستی اور سچائی اس سے زیادہ پختگی اور سادگی کے ساتھ کبھی بھی نمایاں نہیں ہوئی جیسی تہذیبِ اسلامی کے عروج و زوال کی تاریخ میں۔

خلافتِ عثمانیہ اور ترکوں کے کارنامے

آخری عباسی خلیفہ اور اس کے خاندان کا عبرتناک قتل عمل میں آیا اور کچھ عرصہ کے لئے مغل فاتحین نے مغربی ایشیا میں اپنا تسلّط جما لیا لیکن ایک نسل سے کم مدّت بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ ایران میں ایسی مشکلات پیش آئیں کہ مغلوں کو واپس لوٹنا پڑا ترک سرداروں نے اپنی ولایات نئے سرے سے سنبھال لیں۔سلطان قونیہ نے ان ولایات کو اپنی پہلی سی ماتحت حیثیت میں لانے کی ناکام کوشش کی - اس دَور میں عثمانی ترک جلوہ گر ہوئے۔

ترکانِ عثمانی کا عروج جس نے اسلامی سلطنت کو بہ لحاظ وسعت و استحکام بلند تر کر دیا خاندانِ تیموریہ کی تاریخ سے نہایت لطیف مشابہت رکھتا ہے سلطنت عثمانیہ اپنے عروج کے زمانہ میں شان و عظمت کے اعتبار سے اکبر۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کی سلطنت سے کسی طرح کم نہ تھی اسی دَور میں تیسری اسلامی زبان نے جو مکمل طور پر اسلامی ہونے کے باوجود قطعی طور پر ترکی ہی تھی ایک بیش بہا ادب پیدا کیا۔

ترکی ادب اپنی لطافت اور دل افروزی میں اپنی مثال آپ ہی ہے۔ ترکی ادب کی بنا ایک دلفریب لیکن مشکل زبان پر استوار ہے۔ غالباً ترکی زبان کی یہی مشکل زمانہ حال کے مستشرقین کی بے اعتنائی کا موجب ہے۔ عثمانیوں کے دورِ عظمت میں مساجد اور محلات کے ایسے ایسے نادرِ روزگار نمونے معرضِ وجود میں آئے جو صدیاں گذر جانے پر آج بھی فنِ تعمیرات میں اُن کی عظمت و شوکت کی ناقابلِ انکار شہادت دیتے ہیں۔

اسی دور میں اسلامی علوم کے ماہرین جو ایک لٹے ہوئے کاروانِ علم و فضل کی یادگار تھے۔ سمٹ سمٹ کر بروصہ۔ ایڈریانوپل اور استنبول پہنچتے رہے۔ یہ تینوں شہر یکے بعد دیگرے ترکانِ عثمانی کے پایہ تخت رہے ہیں۔ ترکی سلاطین جن میں سے اکثر بلند مرتبہ شاعر اور فنون کے مربّی تھے۔ ان ماہرین کی سرپرستی فرماتے تھے۔

ترکی زبان کی نظم میں میرے لئے ایک خاص کشش و جاذبیت ہے ترکی نظم میں قدرتی طور پر الم و گداز کی فراوانی ہے۔ اور ایک ایسی قوم کے ادب میں جسے زندگی کے ہر موڑ پر صدیوں

موت کا سامنا رہے اور کس چیز کی تلاش کی جائے لیکن ترکی شاعری یاس انگیز نہیں بلکہ ترکی شاعری میں ترکی خصائص قومی کی مناسبت سے فطرت کے لئے ایک قابلِ تعریف ذوق نمایاں ہے۔ ترکی ادب کے نمائندہ نمونوں میں چینی ادب کی طرف جس سے میں تراجم کی بدولت روشناس ہؤا ہوں ایک میلان پایا جاتا ہے۔ اگر مجھ سے دریافت کیا جائے کہ ترکوں نے تہذیب اسلامی کو کیا تحفہ دیا ہے تو میں کہوں گا اپنی خانگی زندگی کی پُرمسرت دل آویزی۔ عالمگیر جنگ (اول) سے پہلے اُن کی خانگی زندگی میں وہی شرافت اور تمکنت پائی جاتی تھی جو ان کی نظم کا طرۂ امتیاز ہے اور جو ہر اُس قوم میں پیدا ہو جاتی ہے جو ہر لمحہ کسی مقصد عزیز کے لئے سربکف رہے اور کون نہیں جانتا کہ ترکوں نے اپنی جانیں کس شانِ بے نیازی سے قربان کیں اور ان کی عورتوں نے کس صبر و ہمت سے ماتم کی ان قیامتوں کو برداشت کیا۔ اُن کی زندگی کے ہر عمل میں ایک شان اور ایک سلیقہ نظر آتا ہے۔ دُنیا کی کونسی قوم ہے جس کے نزدیک ترکوں کے یہ کمالات بجا طور پر قابلِ رشک نہ ہوں۔

ترکانِ عثمانی سب سے اوّل اور سب سے عمدہ سپاہی تھے دوسرے درجہ پر وہ شاعر تھے تیسرے درجہ پر وہ سیاست دان اور چوتھے درجہ پر دینیات کے عالم ہر اگر اُنہوں نے مذہب کے معاملہ میں دوسروں پر اعتماد کیا تو اُس میں اُن کا کچھ قصور نہ تھا۔ مذہب کی زبان عربی تھی اور اُس میں صرف علمأ ہی کو دسترس حاصل تھی اگرچہ قرآن کریم کی ایسی تلاوت بھی جس میں ترجمہ اور مفہوم شامل نہ ہو باعثِ خیر و برکت سمجھی جاتی تھی۔ ترک کا پیشہ سپاہ گری تھا اور اُس کا یہ انداز زندگی کے ہر پہلو میں موجود تھا ترک اپنے روحانی ماہرین پر اسی طرح اعتماد رکھتا تھا جیسے اپنے فوجی رہنماؤں پر۔

عام ترک دَورِ انحطاط میں بھی عہدِ عروج کی طرح مطمئن تھے۔ انحطاط بتدریج اور غیر محسوس طور پر آتا گیا اور سب پر یکساں اثر انداز ہُوا۔ چونکہ دَورِ انحطاط میں بھی عہدِ عروج و اقبال کی تمام شوکت و عظمت ایک گونہ کم از کم بظاہر موجود تھی اس لئے ترکوں کے لئے اپنے انحطاط کا پُورا پُورا احساس کسی تازیانہ کا محتاج رہا۔

سلطنت میں ابتدائی اور ثانوی مکاتب بھی موجود تھے اور یونیورسٹیاں بھی قائم تھیں مکاتب کا کمال قرآن کریم کے ترجمہ و مفہوم سے نا آشنا محض تلاوت کے لئے مسلمانوں کو تیار کرنا تھا۔ یونیورسٹیاں فقیہانہ موشگافیوں کی رزم گاہیں بن چکی تھیں۔ فقہ کی تعلیم تو بلا شبہ ہر مسلمان کے لئے سود مند تھی لیکن اُس زمانہ کی مروجہ تعلیم نے اُسے محض قاتل فہم و ہوش بنا رکھا تھا۔

عدالت، حفظانِ صحت، پولیس، رفاہ عامہ محکمے تو سبھی موجود تھے لیکن اُن سے مناسب عمل کی طاقت مفقود ہو چکی تھی۔ ترکوں کو موجودہ زمانہ میں اپنے انحطاط کا اُس وقت علم ہوا جب دول یورپ نے ترکی عیسائی رعایا کے لئے بہتر حالات مہیا کرانے کے لئے مداخلت کا آغاز کیا۔ ترکوں کو اپنے عسکری نظام کی فرسودگی اور فرو ماندگی کا اُس وقت احساس ہوا جب ایک عہدِ حاضر کی آراستہ فوج سے اُن کا آمنا سامنا ہوا۔ ترکوں کے جوشِ عمل اور اُن کی معاملہ فہمی کا ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ترکوں نے اس احساسِ انحطاط کے بعد اُس کی

تلافی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی ۔

اسلام کے دَورِ انحطاط میں ترک اگر نادان رہنما تھا تو احیائے ملت کی کشمکش میں اُس کی حیثیت ایک دانائے راز رہنما کی ہے ۔ گزشتہ نصف صدی کا ترکی ادب پُرانے ترکی ادب سے بے حد مختلف ہے ادب جدید میں اگر ایک طرف نامق کمال اور اکرم کے وجد انگیز نغمات وطن پرستی کے جذبات اُبھارتے ہیں تو دوسری طرف پرنس سعد حلیم پاشا مرحوم کی تصنیف ، اسلاملشمق ، یعنی اسلامی بنا لو ، بھی نظر آتی ہے ۔ جس میں اصول شریعت کو عہدِ حاضر کی زبان اور ضرورت کے سانچے میں ڈھال کر دکھایا گیا ہے ۔ سعد حلیم کی تشریح و توضیح ملاؤں کے مسلک سے الگ ہے ترکی کا ادبِ حاضر ترقی پسند اور رہنما ہے ۔ یہ ادب باوجود اُن صبر آزما اور قیامت خیز ہنگاموں اور کشمکشوں کے جن سے ترکوں اور اُن کی اسلامی سلطنت کو گزرنا پڑا ہے مستقبل کے لئے سراپا ایک پیام اُمید ہے ۔

مردانِ غازی کا شمار وہاں آج بھی ابطال میں ہے اور شہادت آج بھی کلید جنت شمار ہوتی ہے لیکن ترکی میں

آج جس جہاد کا چرچا ہے وہ ایک جاں بہ لب سلطنت کے بقا کے لئے نہیں بلکہ وہ حریت، ترقی، اخوت اور متابعت الٰہی کا جہاد ہے۔

ترکی کا انقلاب اسلام کے احیائے جدید کا ایک دیباچہ تھا جس کے مسرت آمیز آثار دُنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں جلوہ ریز ہیں۔ اب ہر شخص کو نظر آرہا ہے کہ اسلام کے انحطاط کا سبب ایک دشمنِ علم اور محروم فہم و فراست ملائیت تھی۔

مسلمانوں کو تلاش علم کے لئے نکلنا چاہیئے خواہ چین تک ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ نخلِ اسلام اپنی شادابی اور برومندی کے لئے علم و روشنی کا طالب ہے جہالت اور ظلمت اُس کے لئے طوفانِ موت ہے ❊

خطبۂ سوم

اخوت

میرا آج کا موضوع اخوتِ اسلامی ہے اور میں اس پر بحیثیت ایک آئین اور نصب العین کے اپنے خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں اس موضوع کے آغاز ہی میں میں قرآنِ کریم سے اُن سینکڑوں اقتباسات سے جو اس سلسلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں صرف ایک ہی حوالہ پر اکتفا کروں گا۔

یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہٖ وَلا تموتن الّا و انتم مسلمون واعتصموا بحبل

اللہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمۃ اللہ علیکم
اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم
بنعمتہ اخوانا وکنتم علیٰ شفا حفرۃ من
النار فانقذکم منھا کذٰلک یبین اللہ لکم
اٰیاتہ لعلکم تھتدون ۔

ترجمہ :" اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ (کے ساتھ
اپنے فرائض) کا پورا پورا خیال رکھو اور نہ مرو مگر اس حال
میں کہ تم مسلم ہو۔ تم سب کے سب اللہ کی رسّی کو مضبوط
پکڑو اور آپس میں جُدا نہ ہو۔ اپنے اُوپر اللہ کی مہربانی
کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں کو جوڑا
اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔ تم آگ
کے گڑھے کے کنارے تھے اس نے تم کو اس سے بچایا۔
اس طرح اللہ تم کو اپنی آیات کھول کر بتاتا ہے تاکہ
تم ہدایت پاؤ "

قرآنِ کریم کی ان دو آیات میں ایک طرف تو ظہورِ
اسلام کے فیض سے چند ہی مہینوں میں جو ترقی ہوئی اس
کی یاد تازہ کرائی گئی ہے اور دوسری طرف تمام مسلمانوں

کے نام ایک حکم ہے کہ حبل اللہ یعنی شریعت کو تھامے ہوئے ترقی کے اس راستے پر جمے رہیں اور پھر کبھی اُس ناپاک صورتِ حال کے معرضِ وجود میں آنے کو ناممکن بنادیں جس نے عرب میں قبائل اور جماعتوں کی باہمی خانہ جنگیوں کے ہاتھوں تہذیب انسانی کی مکمل تباہی کا سامان پیدا کر دیا تھا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"مسلمان ایک دیوار ہیں جس کا ایک حصّہ دوسرے کو سہارا دیئے ہوئے ہے۔ ملّتِ اسلامیہ ایک جسم واحد ہے اگر اس جسم کی آنکھ کو تکلیف ہو یا اس کے تلوے میں کانٹے کی خلش محسوس ہو تو تمام بدن کا درد و رنج اور بیتابی و اضطراب میں مبتلا ہو جانا ایک امر لازمی و لابدی ہے"

حجۃ الوداع

آنحضرت صلعم نے حجۃ الوداع پر جبل عرفات میں جہاں وہ لوگ کثرت سے جمع تھے جو چند ماہ یا چند سال قبل ایسی بُت پرستی میں مبتلا تھے جس نے اُن کے

نمبروں کو مُردہ کر دیا تھا۔ فرمایا :-

"اے لوگو میری بات خوب سُن لو اور سمجھ لو کیونکہ میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد پھر بھی کبھی اس موقع اور اس مقام پر میں تمہارے درمیان موجود ہوں گا۔ آپس میں ایک دوسرے کے لئے تمہاری جان تمہارا مال اور تمہاری آبرو اسی طرح لائق احترام ہے۔ جس طرح یہ دن یہ مہینہ اور یہ شہر محترم ہے یاد رکھو تمہیں خداوند تعالیٰ کے روبرو حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہو گی"

"خدا نے ہر حق دار کو وراثت کی رو سے اُس کا حق دے دیا۔ اب کسی وارث کے حق میں وصیّت جائز نہیں۔ لڑکا اُس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہُوا۔ زناکار کے لئے پتھر ہے اور اُن کا حساب خدا کے ذمّہ ہے۔

جو لڑکا اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے جو غلام اپنے مولا کے سوا کسی دوسری طرف اپنی نسبت کرے اس پر خدا اور اُس کے فرشتوں اور تمام بنی نوع انسان کی لعنت ہو گی"

"اے لوگو تمہاری بیویوں پر تمہارے اور بیویوں کے

تم پر حقوق ہیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق انہیں اچھا کھلاؤ۔ پہنا
اور اُن سے لطف و مروّت اور حُسنِ سلوک سے پیش آؤ
کیونکہ وُہ خدا کی طرف سے تمہارے پاس امانت ہیں اور
اُس کے حکم سے تم پر حلال کی گئی ہیں خدا کی مقرر کی ہوئی
حدود کا احترام کرو اور اُن سے تجاوز مت کرو۔"
"ہر سُود باطل قرار دیا جاتا ہے۔ مقروض صرف اصل زر
ہی واپس کرے گا اور مَیں سب سے پہلے اپنے چچا عباس
بن عبدالمطلب کا سُود باطل کرتا ہوں۔ تمہارے غلام
تمہارے غلام! اُن کو وہی کھلاؤ جو خود کھاؤ اور وہی
پہناؤ جو خود پہنو۔ اگر اُن سے ایسا قصور سرزد ہو جو
تم معاف نہیں کر سکتے تو اُن کو علیحدہ کر دو کیونکہ وہ بھی
تمہارے ہی خدا کے بندے ہیں اُن سے بدسلوکی ہرگز
مت کرو۔ جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل
کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کی
طرف سے ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا خون باطل کرتا ہوں
اے لوگو خوب سُن لو اور سمجھ لو کہ مسلمان آپس میں بھائی
بھائی ہیں۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت

حاصل نہیں ۔ تم سب ایک آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے بنا تھا ۔ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں کسی شخص کو دوسرے کا حق غصب نہ کرنا چاہیئے اپنے آپ کو نا انصافی میں مبتلا ہونے سے بچائے رکھو ۔"

"جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ پیغام اُن تک پہنچا دیں جو یہاں حاضر نہیں ۔"

اس خطبہ کے اختتام پہ حضور سرور کائناتؐ نے اُن کثیر التعداد اشخاص کے جوشِ عقیدت سے مسرور ہوتے ہوئے جو چند سال یا چند ماہ پہلے دشمنانِ اسلام تھے باآوازِ بلند فرمایا :-

" اے خدا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا اور اپنی امانت ادا کر دی ۔" اس ارشاد کے جواب میں ہزارہا صدائیں بلند ہوئیں "ہاں آپ نے پیغام پہنچا دیا ۔" حضور نے فرمایا !
" اے خدا گواہ رہیو !"

حضور نبی کریم نے کبھی اصولوں کی محض تعلیم و تلقین پر ہی اکتفا نہیں فرمایا ۔ بلکہ حضورؐ نے ہمیشہ اپنی تعلیم پہ عامل ہو کر نمونہ دکھایا ۔ اگرچہ آنحضرت صلعم حقیقت میں عرب کی

شہنشاہی حاصل فرما چکے تھے لیکن اس پر بھی حضورؐ نے نہ کسی مسند شاہی کو زینت بخشی اور نہ ہی کوئی فرامین شاہی صادر فرمائے۔ حضورؐ اپنی ملّت کے ایک فرد تھے اور حضورؐ کی رہنمایانہ حیثیت ایک ایسے امام کی سی تھی جو اپنی تعلیمات کی پیروی میں خود سب سے پہلے مثال پیش فرمائے جب حضورؐ نے اخوتِ اسلامی کا اعلان فرمایا تو اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ نہیں فرمایا۔ آنحضرت صلعم سب مسلمانوں کے بڑے بھائی تھے اور ہیں۔ غرض رسولِ اکرمؐ تعلیماتِ اسلامی کا پیکرِ مجسم تھے۔

اخوّت سے متعلق مسلمانوں کو کسی دوسرے مذہب عقیدہ یا قوم سے کسی قسم کی عذرخواہی یا شرمندگی کی ضرورت نہیں۔ مسلمان آج اس گئے گزرے زمانہ میں بھی اخوّت سے متعلق اپنے کمالات اور کارنامے نمونہ کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کے پیرو ربوبیت الٰہی اور اخوّت کا اعلان تو ضرور کرتے ہیں لیکن اُن کا اعلان واعتقاد ایک مبتلائے کشمکش دُنیا کے لئے کبھی کسی عملی افادیت کا موجب نہیں ہوا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دوسری قوموں کے اس

نتہائے نظر نے تڑپتی اور سسکتی دنیا کی عملی امداد سے اس درجہ ظالمانہ بے اعتنائی برتی ہے کہ اس اسیر رنج و غم ظلمت کدۂ انسانی نے مذہب کو ایک ظلم و جبر سمجھتے ہوئے خود مذہب ہی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے اور اپنا عقیدہ اُن انسانیت پرست کلیات پر محکم کر لیا ہے جو ایک غلط مماثلت کی بنا پر مذہب نہایاں کفر و الحاد سے وابستہ ہیں۔ ان نئے بتوں کو دنیا نے "آزادی۔ مساوات اور اخوّت" کے دل فریب ناموں سے یاد کیا ہے اور انسانیت کارل مارکس کے مادی عقیدہ کا شکار ہو گئی ہے۔

آزادی، مساوات اور اخوّت، ان میں سے کون سی چیز قابلِ عمل ہے۔ انسانی سوسائٹی میں آزادی اور مساوات ہمیشہ محض اضافی حقیقتیں رہیں گی۔ کیونکہ ان کا مکمل طور پر ظہور پذیر ہونا ناممکن ہے۔ کسی فرد یا کسی قوم کی آزادی ہمسایہ افراد و اقوام کی آزادی سے محدود رہیگی۔ آزادی و مساوات کے مفہوم کا تعین بھی حد درجہ دشوار ہے۔

اخوّتِ اسلامی

انسانی حقوق کو سوسائٹی میں انسانوں کے وجود سے علیحدہ کوئی چیز تسلیم کر لینا اسلامی نقطۂ نظر سے تو ایک نامعقول سی بات نظر آتی ہے۔ حقوق انسان ماں کے پیٹ سے ساتھ نہیں لاتا۔ انسان عطیّات اور ایک شعور فطری ساتھ لاتا ہے۔ سوسائٹی میں حقوق عطیّات کے استعمال اور خواہشات کے دبانے سے پیدا ہوتے اور فرائض کی نسبت سے متعیّن ہوتے ہیں خارج میں اُن کا کوئی وجود نہیں تمام انسانوں کے لئے ہر قسم کی مکمل مساوات کا مطالبہ حد درجہ نامعقول ہے اور اس پر عمل درآمد کا اہتمام انسانیت کو مفلوج کر دینے کی کوشش ہے، تمام افراد کے لئے ہر قسم کی مکمل مساوات کا مطالبہ ایک ایسا مطالبہ ہے جس کی وسعت و نوعیت کے متعلق ایسا اختلاف رائے ہے جس پر دُنیا بحث و نزاع ہی نہیں جنگ و جدل کے لئے آمادہ ہے! اگر ایک شخص اپنے منتہائے آزادی کی تصویر برطانوی دستور میں دیکھتا ہے

تو دوسرے کو آزادی کی دیوی کے درشن نظام سوتیت یعنی دستور روسیہ کے سوائے کہیں نصیب نہیں ہوتے۔

آج آزادی اور مساوات کے لئے ایک عالمگیر جنگ بپا ہے جس کی گرم جوشی و انہماک میں اخوّت کو اس درجہ فراموش کیا جا رہا ہے کہ وہ مفقود و نابود ہو رہی ہے۔ حالانکہ اخوّت اُس وقت بہ آسانی حاصل کی جا سکتی ہے۔ جب نیک نیتی اور خیر اندیشی سے ایک ضابطہ قوانین کو مذہبی پابندی کے ساتھ اپنے اُوپر لازم کر لیا جاوے۔ لیکن اگر آپ کو اخوّت کے عملی وجود کی تلاش ہے تو نہ ہی گذشتہ تاریخ عالم میں اُس کی کوئی مثال ملے گی اور نہ ہی موجودہ دُنیا میں یہ لفظ آپ کو کہیں شرمندۂ معنی نظر آئے گا۔ اگر دُنیا نے دولت اخوّت کو کبھی کہیں پایا ہے تو دامنِ اسلام ہی میں پایا ہے۔ ان حالات سے مجبور ہو کر انسان اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ انسانی برادری کی صورت میں کسی جمہوریت کا قیام الٰہیت کے اقرار و اعتراف کے بغیر ناممکن ہے۔ بنی ناصری نے انسانی برادری کا ایک نصب العین

پیش کیا جس کی بنیاد عملاً اُس الٰہیت پر ہے جو یہودیوں میں رائج تھی۔ لہذا اس پہ کبھی عمل نہیں ہوا کیونکہ الٰہیت عیسائیت میں سوسائٹی کی بنیاد تو کیا کبھی نظامِ حکومت تک کی بنا نہیں بنی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تاریخ عالم میں سب سے پہلے نہ صرف انسانی برادری کا اعلان ہی فرمایا بلکہ اُس پر سوسائٹی کی بنا استوار کی اور اُسے ایک بنیادی اور عملی قانونِ زندگی کا مرتبہ بخشا۔ حقیقی انسانی ترقی کی بنیاد اخوت ہی ہے اور اسلام کے تمام قواعد کا میلان اسی ہی کی طرف ہے۔ معاشرتی تفریق قائم رہی اور انفرادی آزادی پر وہ پابندیاں بھی قائم ہیں جن کا وجود ایک منظم جماعت میں لابدی ہے۔ لیکن اسلام نے افراد اور اقوام میں سیرت، مرتبہ، دولت اور قوت و اختیار کے گوناگوں اختلافات کے باوجود مستقل باہمی برادرانہ تعلقات قائم کر دیئے۔ حضور کا ارشاد ہے: "جو غلام نماز پڑھتے ہیں تمہارے بھائی ہیں" اور یہ کوئی زبانی جمع خرچ نہ تھا۔ غلاموں کے

ساتھ مسلمانوں نے فی الحقیقت بھائیوں کا سا سلوک کیا۔ اقوامِ عالم کے باہمی ارتباط سے بھی ایک اسلامی برادری اور ملت پیدا ہوئی جو بفضلِ خدا آج بھی موجود ہے۔ آنحضرت صلعم نے مسلمان اقوام کے دلوں سے جارحانہ قومیت کے جذبات کو اپنے اس ارشادِ قدسی سے مٹا دیا کہ " وہ ہم میں سے نہیں جو ظلم میں اپنے قبیلے کا ساتھ دیتا ہے اور وہ ہم میں سے نہیں جو دوسروں کو ظلم میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں جو اپنے قبیلے کی ظلم میں اعانت کر رہا ہو اور موت اُس کو آن لے "

اسلام نے ایک ایسی عالمگیر ملّت کی بنا استوار کی جس کی وجہ سے محدود و فرد تر قومیت کا نشہ مسلمانوں کے اندر سے کافور ہو گیا اور جس کی بدولت اپنے ملک کے لئے حق و ناحق کی خاطر جنگ آزما ہونا، اُنہیں عہدِ جاہلیت کی ایک دیوانگی نظر آنے لگا۔ حضورؐ نبی کریم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ " راستی پر عمل کرنے والا حبشی ناراستی پر عمل کرنے والے

قریشی سے فرماں روائی کا زیادہ حق دار ہے۔" نسب، دولت اور قوت کے مقابلہ میں خدمتِ ملت اور خدمتِ خلق کو قوم کی طرف سے عزّت و احترام کا معیار قرار دیا گیا۔

ارشاد قدسی ہے " دوسروں سے ایسا ہی سلوک کرو جیسے سلوک کی تم اُن سے توقع رکھتے ہو" احمق اشخاص کو اس اُصول کی راستی اور صداقت کا کس طرح قائل کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے اشخاص اس نوعیت کی معاشرتی صداقتوں کو ذاتی مفاد کی بنا پر سمجھنے سے قطعاً عاری ہوتے ہیں اِلّا اس صورت میں کہ اُن پر وہ کیفیت طاری ہو سکے جو اُن کے ظلم کی وجہ سے دوسروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اسلام نے قانون قصاص کو استوار کیا جسے بعض لوگ بعض اعتبارات سے ظالمانہ سمجھتے ہیں۔ اصولِ قصاص جیسی کہ مسلمانوں کو اس کی تعلیم دی گئی ہے ظالمانہ نہیں کیونکہ اُنہیں زیادتی یا قصاص کو نوعیت جرم سے بڑھا لینے کی شدید ممانعت ہے۔

مسلمانوں کو تعزیر کو معیاری بنانے یعنی دوسروں کو ڈرانے اور عبرت دلانے کے لئے کسی مجرم کو اُس کے جرم کی نسبت سے زیادہ سزا دینے کی ممانعت ہے "تم پر حیف ہے اگر تم ایک جنگلی کتے کو بھی عبرت ناک یا معیاری سزا دو" قصاص میں بے لاگ انصاف ہی سزا کی ایک مثال ہے جو بنی نوع انسان کے لئے ایک حقیقی قدر و قیمت کی حامل ہے۔

احکامِ الٰہی جیسے کہ وہ قرآن کریم میں درج ہیں صرف اس اصول کی توضیح و تفسیر ہیں کہ "دوسروں سے کے ساتھ ایسا سلوک کرو جیسا تم چاہتے ہو کہ لوگ تم سے کریں" یہ اصول تعلیم اسلامی نے اس قدر صاف و واضح بنا دیا اور اس طرح مدوّن کر دیا ہے کہ افراد اور جماعات کو مختلف حالات میں اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت اور طریق سے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

ربوا

ربوا جماعتی مفادات کے لئے پیامِ ہلاکت اور جذبۂ

اخوت و مروت کے لئے پیغامِ موت ہے۔ کسی بھائی کی مصیبت اور مجبوری پہ اپنی ترقی کی بنا قائم کرنا اخلاقِ اعلیٰ کی دُنیا میں تو کمینگی ہی کہلاتی ہے اس لئے ارشاد فرمایا گیا ہے :-

یمحق اللّٰہ الربٰوا ویربی الصدقات واللّٰہ لا یحب کل کفار اثیم۔

ترجمہ۔ اللہ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بار آور بناتا ہے اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔

دولت کا بخیل کی طرح سمیٹتے ہی چلا جانا اور خزانے کے سانپ کی طرح اُس پہ بیٹھ جانا بنی نوع انسان کے خلاف ایک ظلم عظیم ہے اس لئے مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی دولت کے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اپنی ضروریات سے جو کچھ زائد بچے وہ اُسے صرف کر ڈالے۔ میں نے ربوا کے متعلق جس آیت کا حوالہ دیا اُس میں ایک حقیقت مستور ہے جو اکثر لوگوں کی نظر سے آج بھی پوشیدہ ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ حصولِ دولت کے

لئے ننگ و دو انسانی مسرت و تہذیب کو بڑھاتی ہے اور تہذیب و مسرت کا حصول صرف دولت کی مناسب گردش یعنی افراد کی حرص و ہوا کو کم کرنے اور اُن کے جذبۂ فیاضی کو بروئے کار لانے سے ممکن ہو سکتا ہے دوسروں کا تو کیا ذکر خود مسلمانوں میں آج بہت سے لوگ حرمتِ سود کو ایک دقیانوسی قانون بتاتے ہیں ایسے لوگوں نے عہدِ حاضر کے طمطراق اور شان و شوکت کو حقیقت بین نگاہوں سے نہیں دیکھا عہدِ حاضر کی کاروباری زندگی کے بہت سے طریقے جن کو اسلام ناروا سمجھتا ہے۔ سُود کے مقابلے میں جس کی مذمت ہر معقول و شائستہ انسان کرتا ہے بے ضرر معلوم ہوتے ہیں۔ ربوا کے بدل کے طور پر تو موجودہ نظام مالیات نہایت غنیمت نظر آتا ہے لیکن اس کا معاشرتی اثر ہمیشہ جذبۂ مروّت و انسانیت کے خلاف رہا ہے۔

آج سوشلزم۔ کمیونزم اور سینڈیکلزم سوسائٹی کے سرمایہ دارانہ نظام کی بربادی پر جیسے مشکل سے ایک

صدی زندگی نصیب ہوئی ہے کیوں آمادہ ہیں؟

اس کی کیا وجہ ہے کہ جب روس میں بولشویکوں کو اقتدار حاصل ہوا تو اُن کا سب سے پہلا کام سُود کی ممانعت تھی؟ سُود کی ممانعت ہر نوعیت کی اشتراکیت کے نظام میں کیوں شامل ہے؟ اس لئے کہ سُود سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی بنیاد ہے اور سُود کو ناجائز قرار دینے والوں کی رائے میں سُود ہی تمام معاشرتی بُرائیوں، مظالم اور ناانصافیوں کی بنیاد ہے۔ شریعت اسلامیہ نے سُود کو حرام اور تجارت کو حلال قرار دیا ہے۔ یہ امر ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم نے جس قسم کی تجارت کو جائز و حلال قرار دیا ہے وہ آج کل کی بے پناہ منافع اندوزی کی تجارت نہیں جس کا حصّہ غالب میری نظر میں ربوا سے مختلف نہیں کیونکہ اس تجارت کو بھی عوام کی بیچارگی اور بے بسی سے فروغ حاصل ہوتا ہے۔

دولت کا حصول اور مصرف

شراب نوشی ایک معاشرتی گناہ اور جوا ایک عیب ہے، منشیات کا استعمال ممنوع ہے۔ اسی طرح وہ کھیلیں جن میں کامیابی کا انحصار محض اتفاق پر ہو ممنوع ہیں۔ اسلام نے شخصی مِلک کی اجازت ضرور دی ہے اور اُسے خوب محکم بنایا ہے۔ لیکن اس نظریہ کو کہ جائداد محض فرد ہی کی مِلک ہے اور اُسے جیسا چاہے خرچ کر سکتا ہے اور وصیت کے ذریعہ جیسے چاہے دے سکتا ہے ایک معاشرتی گناہ سمجھتے ہوئے مردود قرار دیا گیا ہے مال و دولت خدا کی طرف سے ایک امانت ہے اور شریعت کی صاف اور واضح شرائط کے ماتحت انسان اُس کا حامل ہے۔ مسلمان کی آمدنی کا ایک خاص حصّہ غریبوں اور محتاجوں کا حق ہے اور اس کا ایک خاص حصّہ سالانہ نذرِ ملّت ہونا چاہیئے۔ جب کوئی مسلمان صاحبِ جائداد جنّت کو سدھارے تو اُس کی جائداد

خاص نسبت سے رشتہ داروں کے وسیع حلقہ میں تقسیم ہونی چاہیئے۔ مسلمان کے مال و دولت میں مردوں اور عورتوں کے خاص خاص حصے معین کردیئے گئے ہیں۔

اخوّتِ اسلامی اور انسانی برادری

جارحانہ قومیت کا تخیل نوع انسان کے حق میں زہر قاتل ہے اس لئے اسلام نے اس جذبہ کو مٹا دیا ہے۔ اخوّتِ اسلامی نے نسل و رنگ کے امتیازات یکسر مٹا دیئے اور آئین اخوّت نے جماعتوں کے اختلافات کو دُور کر کے انسانوں کے درمیان نخوت، ذلّت اور نفرت کے جذبات کا قلع قمع کر دیا ہے۔ پیشوں کا اختلاف البتہ لازماً قائم رہتا ہے۔

تہذیب اسلامی ایک نظام کامل ہے جو انسانی خیال و عمل کے ہر میدان پر حاوی اور مادّیات اور روحانیات پر برابر مسلّط ہے یہ نظام تاریخ عالم میں زیرِ عمل رہ کر عدیم النظیر کامیابی و کامرانی حاصل کر

چکا ہے۔

میں نے اپنے گزشتہ خطبہ میں تہذیب اسلامی کے انحطاط کی تاریخ دہراتے ہوئے شریعت کے بعض احکام کی خلاف ورزی کو اس کا سبب قرار دیا تھا۔ نظامِ اسلامی آج کہیں زیرِ عمل نہیں لیکن اس گئے گزرے زمانے میں بھی کم از کم اخوت کے اعتبار سے تو مسلمان دوسری اقوام عالم سے آج بھی اتنے ہی آگے ہیں جس قدر وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، عمر ثانی، ہارون الرشید، صلاح الدین یا سلیمان کے زمانے میں تھے اسلام نے تاریخ عالم میں ہر نوعیت اور ہر حیثیت کے انسانوں کی جن کا تعلق مختلف جماعتوں اور قوموں سے تھا اور ہے ایک ایسی ملت واحدہ پیدا کر دکھائی ہے جس کے رشتہ مودت و محبت اور نسبت یگانگت کو مخالف افواج کے حملے اور سیاست کی عیارانہ اور شاطرانہ چالیں گزند نہیں پہنچا سکیں۔ جمعیۃ الاقوام مختلف اقوام کے باہمی اتفاق و اتحاد کی خاطر ایک بین الاقوامی امن و ترقی کا نظام استوار کرنے کی خاطر معرض وجود

میں آئی لیکن یہ تو اُس مقصد بلند کا ایک نہایت ہی
حقیر مظہر ہے جو اسلام نے عالم انسانیت کے روبرو
عالم اسلام کے عمل سے پیش کر دیا۔ جمعیۃ اقوام کو
طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا ہے۔ جمعیۃ یا لیگ
ظالمانہ یا جارحانہ قومیت اور سامراج کے اصولوں کو
تسلیم کرتی ہے۔ لیگ کی تشکیل میں اُن قوموں نے
حصّہ لیا ہے جو ایسے انسانیت سوز اصولوں کی حامی
اور پرستار ہیں اس لئے یہ اُمید کہ لیگ ان اصولوں
کو مانتے ہوئے موجودہ مشکلات کے باوجود انسانی دُکھ
کا کوئی مداوا پیش کر سکے گی ایک خوش فہمی سے زیادہ
حیثیت نہیں رکھتی۔ انسانی مصائب کا حل تو اس اصول
کا عملی اعتراف ہی ہے کہ اقوام کو افراد کے سے
حقوق حاصل ہیں اور ان کے لئے وہی اخلاقی معیار اور
قوانین ہیں جن پر افراد کو ماپا جاتا ہے۔ لیگ آف نیشنز
کا منتہائے نظر اور مقصد اخوت اسلامی کا سا نظام
ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ملّت اسلامیہ میں دلوں کا اتحاد موجود
ہے کون نہیں جانتا کہ دُنیائے اسلام کی سیاسی بے بسی

اور پراگندگی کے باوجود مسلمانانِ عالم کے دل آپس میں ملے ہوئے ہیں اخوتِ اسلامی کے اسی نظارہ سے بیتاب ہو کر ہی تو بعض لوگ چلّا اُٹھتے ہیں کہ مسلمان قومیت پرستی کی لاف زنی کے باوجود وطن پرستی کے جذبہ سے عاری ہیں اُن میں تو جوش مذہبی کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے۔ یہ بدنصیب لوگ تو چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے بلند ترین اور برترین بین الاقوامی اصولوں کو خیرباد کہہ کر جارحانہ قومیت کو اختیار کر لیں۔ اگر خدا نخواستہ مسلمانوں نے کبھی ایسا کیا تو وہ قرآن کریم کے الفاظ میں "بہترین چیز کے عوض بدترین چیز لیں گے" جیسا کہ بنی اسرائیل نے کیا۔ اسلام نے ان مسائل کے حل میں یورپ کو اپنے ظہور سے آج تک اپنی گرد تک کو پہنچنے نہیں دیا۔

اخوتِ اسلامی کا قیام اور اُس کی ہمہ گیریاں چند اصولوں پر مبنی ہیں یہ ایک ایسا بے نظیر جذبہ ہے جس نے گورے اور کالے اور سرخ و سیاہ کو مکمل اتحاد اور مساوات کی دولت بخشی ہے۔ اسی جذبہ نے

غریب و امیر، نادار و زردار آزاد اور غلام اور حاکم و محکوم کے مطالبات کو باہم ایک ربط دے دیا ہے۔

نماز اور حج

اخوتِ اسلامی کا ایک عملی مظاہرہ تو ہماری نماز باجماعت ہے جس میں روزانہ اور ہفتہ میں ایک مرتبہ زیادہ بڑے پیمانہ پر مسلمان جمع ہوتے ہیں جہاں "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" کا دل افروز نظارہ دُنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ نماز میں امامت دولت اور منصب و جاہ کو نصیب نہیں ہوتی بلکہ تقویٰ، پرہیزگاری اور علم کے حصہ میں آتی ہے۔
حج اسلام کا ایک اہم رُکن ہے جس پر اس عیش و عشرت کے زمانے کو اسلام کی پستی کی پھبتی سوجھتی ہے حج میں شاہ و گدا۔ امیر و فقیر اور آقا اور غلام سبھی ایک موٹے لباس میں ملبوس ہوتے ہیں اور ایک ہی طریق پر ایک ہی قسم کے شعائر ادا کرتے ہیں۔ اُن میں ایسی قطعی مساوات پائی جاتی ہے۔ جو موت شاہ و گدا

کے درمیان قائم کر دیتی ہے۔ ہر صاحب استطاعت
مسلمان پر کم از کم ایک حج واجب ہے۔ حج کی تیاری
میں مسلمان وصیت کرتا ہے۔ گھر بار چھوڑتا اور کاروبار
سے منہ موڑ لیتا ہے۔ طویل اور صبر آزما سفر پہ بغیر
کسی نفع دنیادی کے خیال کے چل کھڑا ہوتا ہے۔ وائے
نادانی! دنیا میں کتنے ہی لوگ اس سفر کو جو مسلمان کے
لئے ہزاروں سعادتوں اور برکتوں کا سرمایہ دار ہے
ایک فعل عبث سمجھتے ہیں۔

روزہ

رمضان المبارک مہینہ بھر کی ایک سالانہ تقریب تربیت
ہے جس میں جو بیمار یا مسافر نہ ہو سحر سے شام تک
پورا پورا روزہ رکھتا ہے۔ روزہ شاہ و گدا، غلام و آقا
بندہ و آزاد سبھی پہ فرض ہے۔ آج اس مہذب دنیا
میں ان لوگوں کی کوئی کمی نہیں جو روزہ کو (نعوذ باللہ)
ایک فعل عبث کہتے اور سمجھتے ہیں۔ لیکن کوئی شخص جو
انسانی زندگی کے نشیب و فراز پہ ذرہ برابر نظر رکھتا

ہے اور یہ جاننا ہے کہ مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے کس قسم کی تربیت کی ضرورت ہے ایک لمحہ کے لئے بھی روزہ کی افادیت پر شبہ نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کو زندگی کی جدوجہد میں وقت آن پڑے پر سپاہی کا انداز اختیار کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ بالخصوص اُن لوگوں کو جو بنی نوع انسان کی ترقی کے اصولوں کی خاطر کمر بستہ ہونا چاہتے ہیں۔ اصل میں یہ تمام ہنگامی قانون حضور رسول اکرمؐ کے اس ارشاد "موتوا قبل ان تموتوا" یعنی "موت سے پہلے مر جاؤ" کی ایک عملی تفسیر ہیں اور حقیقت میں خود اسلام رضا الٰہی پر جیسا کہ وہ قرآن کریم میں وحی اور کائنات میں ظاہر کی گئی ہے انسانی ارادہ اور رائے کی قربانی کا نام ہے۔ نماز کو دیکھئے۔ مصلی قبر کے مشابہ ہے۔ رکوع اللہ کی شہنشاہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ سجدہ اشارۃً ایک موت ہے جس کے معنے قیامت کے روز خداوند تعالیٰ کے حضور میں اپنے آپ کو پیش کرنا ہے۔

رمضان المبارک میں مسلمان کی زندگی میں ایک انقلاب آجاتا ہے۔ شام کی اذان تک امیر و غریب سبھی بھوک کی سختیاں سہتے ہیں اور جب اذان اس امر کی اجازت دیتی ہے تو مسلمان بادشاہ بھی پانی کا ایک گلاس الحمد للہ پکار کر شکرِ نعمت کے احساس و اقرار سے پیتا ہے۔ حج پر مسلمان گویا ایک طرح سفرِ آخرت کے لئے کمر بستہ ہوتا ہے۔ وہ اپنا کاروبار چھوڑ دیتا ہے اپنے قرض چکا دیتا ہے۔ اپنی وصیت کرتا اور دنیا کے دھندوں سے نجات پا کر گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں اور دل آویزیوں کے ساتھ بنی نوع انسان میں عداوت اور رقابت پیدا کرتی ہے موت ادنیٰ و اعلیٰ اور شاہ و گدا کا فرق مٹا کر سب کو ایک کر دیتی ہے۔ موت ہم سب کے لئے اعلان ہے کہ اللہ کے حضور ہم سب برابر ہیں۔ ہمارا غرور، ہماری دولت و قوت اور شوکت و عظمت غرض وہ تمام چیزیں جو زندگی میں انسانوں کے لئے وجہ امتیاز بنی ہوتی ہیں قبر کی سرحد

پہ ختم ہو جاتی ہیں۔

ایں ہمہ ہیچ است چوں می بگذرد
تخت و بخت و امر و نہی و گیر و دار

موت بلا شبہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور وہ نظام جو اس واقعہ کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتا ہے یقیناً راہ راست سے ہٹا دینے والا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ موت کے انتظار اور خوف میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا اس دنیا کے حقوق سے غفلت برتنا ہے جس کی بادشاہت دوسری بادشاہتوں کی طرح صرف اللہ ہی کو سزا وار ہے۔ اسلام ہمارے روبرو وہ نظام زندگی پیش کرتا ہے جس کی پیروی انسان کو موت کے خوف سے نجات دلا دیتی ہے اور موت کو ہمارے سامنے اپنے اصلی رنگ میں لا کھڑا کرتی ہے۔

اسلام کا راستہ امید و مسرت کا راستہ ہے غم اور مایوسی کی راہ نہیں۔ یہ حقائق عام لوگوں کے لئے سادہ و محکم ہیں اور ارباب دانش و بینش کے لئے

حد درجہ حکمت آموز اور تمام انسانوں کے لئے انسانی برادری کی محکم ترین بنا۔

زکوٰۃ اور اسلام کا مالی نظام

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ مسلمان اخوت کے معاملہ میں دوسرے مذاہب سے آج بھی اسی قدر آگے ہیں جس قدر اُس زمانہ میں تھے جب آفتابِ اسلام شوکت و عظمت کے نصف النہار پہ تھا۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ اس اعتبار سے مسلمانوں میں کوئی انحطاط رونما نہیں ہوا۔ بلکہ مُراد یہ ہے کہ آج بھی اخوت کا جیسا کچھ وجود مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ اُس کا شمہ تک بھی دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں نظر نہیں آتا۔

مسلمانوں کا انحطاط جہاں کہیں اور جس اعتبار سے نظر آئے گا اُس کا سبب وہی شریعت مصطفوی کی خلاف ورزی ہو گا۔ اخوت سے متعلق مسلمانوں کے انحطاط کی وجہ زکوٰۃ سے انحراف اور اُس کے نظام کا انہدام ہے۔

زکوٰۃ کے معنے کاشت کے ذریعہ بڑھانا ہے
جس زمانہ میں زکوٰۃ ادا ہوتی تھی اور جو کچھ بچ جائے
اُسے بیت المال میں جمع کیا جاتا تھا (بیت المال
ایک قسم کا بنک تھا جو تمام قوم کی ضروریات کا کفیل
ہوتا تھا) تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ مسلمانوں
میں اُس زمانے میں ناداروں کی کمی تھی۔ جن اسلامی ممالک
میں آج زکوٰۃ باقاعدہ وصول کی جاتی اور تقسیم ہوتی ہے
(مثلاً نجد میں) وہاں مسلمانوں میں آج بھی ناداروں کا
وجود نہیں، جن اسلامی ممالک میں نظام زکوٰۃ مفقود
ہے اُن میں ناداروں کی بہتات ہے۔ اس غفلت اور
اُس کے نتیجہ یعنی مسلمانوں کی زبوں حالی کے لئے عوام
کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ گذشتہ زمانہ کی
اُن مطلق العنان حکومتوں کا گناہ ہے جنھوں نے اپنے
تمام امور کو عوام کے ہاتھوں سے نکال لیا اور اس
طرح ایک عرصہ تک انہیں سبقتِ عمل سے محروم کر دیا
اور اس طرح انہیں ایسے امور کی انجام دہی میں بھی
سرکاری عمّال پر بھروسہ کرنے کی عادت ڈالی جن کا خود

انجام دینا اُن کا اسلامی فرض تھا۔

مسلمانوں کی ہر جماعت کا جو مسلمانوں کی ترقی اور خوش حالی کی خواہاں ہے، اوّلین فرض ہے کہ وہ ضروری تحفظات کے ساتھ نظامِ زکوٰۃ کو از سرِ نو استوار کرنے کی سعی کرے بلکہ ایسے افراد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے مکمل نظامِ مالیات کا مطالعہ کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال عام ہے کہ اسلام کا سرے سے کوئی مالی نظام ہی نہیں نہ مسلمانوں میں کوئی کاروباری صلاحیت ہے اور نہ ہی کوئی مسلمان ماہرِ مالیات گذرا ہے۔ زمانۂ جدید میں البتہ انگریزی تعلیم و تربیت کی بدولت سر اکبر حیدری ایک مسلمان ماہرِ مالیات پیدا ہوئے ہیں۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام کا نظام مالیات ایک مکمل نظام ہے اور مسلمانوں میں بڑے بڑے ماہرِ مالیات گذرے ہیں دِقّت صرف یہ ہے کہ زمانہ حال کے کاروباری لوگوں کے لئے مسلمان تاجروں اور ماہرین کے طریقوں کے سمجھنے کی کوشش بھی ایک مشکل کام ہے کیونکہ اُن کے اعمال کا

محورِ ذات اور ریاست کے لئے بیجا نفع اندوزی کے بجائے رفاہِ عامہ یعنی ملت کی خوش حالی اور سود و بہبود تھا۔ تہذیب اسلامی کی برتری اور کامرانی میں اس نظریہ و عمل کو بڑا دخل حاصل تھا اور اسی جذبہ و عمل کا بتدریج مٹ جانا ہی تہذیب اسلامی کے انحطاط کا سبب ہوا ہے۔ اسلامی مالیات پر مستشرقین نے کچھ کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں ایک امریکن پروفیسر کی کتاب خاص طور پر قابلِ تذکرہ ہے۔ اس امریکن پروفیسر کا خیال ہے کہ اسلامی مالیات کو تہذیبِ افکار اور دنیائے علم میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ وہ قدیم اسلامی نظام جو قوانین شریعت کے ماتحت معرضِ وجود میں آیا اور ایک عظیم الشان سلطنت میں زیرِ عمل رہا اُن مسلمانوں کے لئے خاص دلچسپی کا موجب ہوگا۔ جن کے دل و دماغ میں موجودہ نظام مالیات و تجارت نے ایک خلش پیدا کر دی ہے۔

کسی مضبوط جماعت کی تعمیر یا رو بہ انحطاط جماعت میں زندگی کی لہر دوڑا دینے کا یہی ایک سہل ترین،

آسان ترین ، مؤثر ترین اور مجرب نسخہ ہے لیکن یہ طریق ہر شخص سے قربانی کا طالب ہے جب ہم اپنے اعمال وکردار کو شریعت کے تابع فرماں بنا لیں تو ہمیں اس تمام مال و دولت اور اُن عطیات کو جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں مرحمت فرمائے ہیں اپنی ذاتی رائے نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے مطابق خرچ کرنا ہوگا۔

زمانۂ حال کے خداؤں کا فرمان ہے " جس قدر ممکن ہو پس انداز کرو۔ اندوختہ کے لئے کوئی شغل تلاش کرو اُسے سود پہ دے ڈالو اور کچھ نہ ہو تو بنک میں ہی جمع کرا دو " لیکن قرآنِ کریم کا ارشاد ہے " جو کچھ بچ رہے وہ خرچ کرو۔ یعنی اپنی اور اپنے لواحقین کی ضروریات پوری کر لینے کے بعد ، زکوٰۃ کے بعد اور معقول اور مقررہ خیرات وصدقات ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے اُسے اس طرح خرچ کرو کہ تمہارے بھائی بندوں کو اُس سے نفع حاصل ہو اور مستحقین کی اُس سے حوصلہ افزائی ہو اور بنی نوع انسان کی برادری کا احساس وشعور اُس

سے پرورش پاسکے ۔ اسلام نے ربٰوا کو حرام قطعی قرار دیا ہے ۔ یہ ایک مصیبت زدہ بھائی کا خون چوسنا ہے اسلام نے ایسی ہی شدت کے ساتھ اسراف کی ممانعت بھی فرمائی ہے ۔ اسراف کے معنے خدا کی دی ہوئی دولت و نعمت کا اس طرح ضائع کرنا ہے کہ کسی کو اس سے کوئی حقیقی فائدہ نصیب نہ ہو بلاشبہ دنیا کو آج شریعت اسلامی کے بعض احکام حیرت انگیز نظر آتے ہیں اور دنیا بظاہر اُن کی مصلحت و حکمت کے سمجھنے سے قاصر ہے ان احکام کی مصلحت سمجھ لینے کے لئے اُس اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ احکام ایک ایسی جماعت کے لئے وضع کئے گئے ہیں جس کی بنا مقابلہ اور مسابقت نہیں برادری اور اخوت ہے ۔ یہ احکام تو اُس جماعت کے لئے ہیں جس میں کسی کو فاقوں مرنے نہیں دیا جاتا اور جس جماعت نے جب تک وہ قائم رہی زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ آسائش کی ایسی مثال قائم کر دی تاریخ جس کا جواب پیش کرنے سے عاجز ہے میری رائے میں آج کل

کے مسلمانوں کے لئے اسلام کے نظام مالی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

تعلیم

مسلمانوں کے انحطاط کا ایک دوسرا سبب مسلمان مرد و عورت کی حصول تعلیم کے حکم سے سرتابی ہے۔

ہندوستان میں تو اس ارشاد کی نافرمانی ایک المناک حد تک پہنچ چکی ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک مثلاً مصر اور مملکت ترکیہ میں موجودہ دَور تعلیم کے آغاز سے پیشتر بھی عالمگیر تعلیم کا ایک نظام موجود تھا۔ یہ نظام ایک زمانے میں تو ضرور رہنمایانہ حیثیت رکھتا تھا لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس نظام پر غفلت، جمود اور غنودگی طاری ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی بدولت اتنا تو ضرور تھا کہ ہر مسلمان تعلیمات اسلامی اور فرائض مذہبی سے تھوڑی بہت واقفیت ضرور حاصل کر لیتا تھا۔ ہندوستان تو آج ایسے نظام سے بھی محروم ہے۔ ہندوستان میں کتنے ہی ایسے مسلمان موجود ہیں

جو مذہب سے قطعاً ناواقف ہیں اور ممکن ہے کلمہ شریف بھی نہ جانتے ہوں پھر ایک لطیفہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے قریباً تمام اسلامی ممالک میں مغربی علوم کی ترویج و اشاعت کی مخالفت کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عالم اسلام علم کی دوڑ میں دوسرے ممالک سے پیچھے رہ گیا۔ اس نے دوسروں کو اپنے اوپر مسلط ہوتے دیکھا اور اُس کی وجہ نہ سمجھنے کی بنا پر عالم اسلام رنج و دلگیری اور اندوہ و یاس میں مبتلا ہو گیا اور ہر طرف افلاس و غربت و ناداری نے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس افسوسناک صورت حال کا ایک معقول عرصے میں مداوا ہو سکتا ہے اور خدا کا شکر ہے بہت سے لوگ اس علاج کی فکر میں ہیں۔ لیکن جب تک موجودہ حالت قائم ہے دیکھنے والوں کے لئے اخوت اسلامیہ کی اُس بے نظیر مشعل کی روشنی جس نے تاریخ کے اوراق کو درخشاں کر دیا ہے ماند سی پڑی رہے گی۔

مسلمان بادشاہوں کی رقابتیں اور آویزشیں۔ سیاسی آرا کا اختلاف اور نسل و رنگ کا امتیاز اخوت اسلامی

پر نہ کبھی اثر انداز ہوئے ہیں نہ ہوں گے۔ غیر مسلموں
کے لئے پیروانِ اسلام کا یہ کارنامہ ایک معمہ ہے
کسی اجنبی شخص کا اپنے آپ کو مسلمان بتانا اور
السلام علیکم پکارنا مخاطب مسلمان کے دل میں مسرت و
یگانگت کے جن جذبات کی ایک سرور انگیز لہر دوڑا
دیتا ہے اُس کے لطف روح پرور کے احساس سے
غیر مسلم قلب ہمیشہ محروم رہے گا۔
مسلمانوں کا باہمی اختلاف شدید اصولی اختلاف
نہیں۔ مسلمانوں کا اختلاف مقاصد سے نہیں ذرائع سے
اور منزل سے نہیں راستے سے متعلق ہے۔ ہر مسلمان
کی منزلِ مقصود منزلِ اسلام ہے اور منزلِ اسلام توحید
الٰہی کے عقیدہ کی بنا پر بنی نوع انسان کی اخوت
کا ظہور ہے۔ ہمارا اختلاف تو محض حصول مقصد کے
طریقوں سے متعلق ہے۔ انشاء اللہ باقاعدہ اسلامی تعلیم
کی ترویج یعنی معارف قرآنیہ کا علم اور تعلیمات اسلامی
کا زمانۂ حال کی ضروریات سے مقابلہ اور تطابق
ہمارے اختلافات کو رفع کر دے گا اور اسلامی

اخوت کی حدود سے متعلق جس کی آغوشِ رحمت میں مسلم اور غیر مسلم بھی جو اس زمین پہ خدا کی بادشاہت کے قیام کے خواہاں ہیں شامل ہیں تمام غلط فہمیاں کافور ہو جائیں گی ۔

خطبۂ چہارم

سائنس۔ فنون اور ادب

میں آج آپ حضرات کو سائنس۔ ادب اور فنون میں مسلمانوں کے کمالات کی ایک مختصر داستان سنانا چاہتا ہوں۔ اس مختصر جائزہ میں میں قرآن کریم سے کہ اسلام کا شاہکار بلکہ اعجاز ہے بحث نہیں کروں گا کیونکہ قرآن کریم اسلام کی تمام تہذیبی ترقی کا ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلام کے جملہ کمالات کا سرچشمہ ہے۔ سائنس کو لیجئے ایک طرف تو قرآن کریم نے

انسانی عقل و شعور سے اپیل کی اور فطرت کو معجزات سے بلند تر مرتبہ عطا فرمایا۔ دوسری طرف آنحضرت صلعم نے حصولِ علم کی فضیلت کو ارشادات قدسی سے مسلّم بنایا۔

" علم کی تلاش ہر مسلمان مرد و عورت کا مذہبی فریضہ ہے۔"

" علم کی تلاش کرو خواہ وہ چین ہی سے حاصل ہو۔"

" خدا کی مخلوق کے مطالعہ اور غور و فکر کی ایک ساعت سال بھر کی عبادت سے افضل ہے۔"

اس طرح احکامِ ربّانی اور ارشاداتِ نبوی نے تہذیبِ اسلامی کی بنا اللہ کے نام اور آزادیٔ فکر اور آزادیٔ تحقیق و اکتشاف پر رکھی۔

قرآنِ کریم اور فی الحقیقت کسی دوسرے صحیفہ الہامی میں کسی سائنٹفک مرقع کی تلاش ایک اُمیدِ موہوم اور ایک سعی لا حاصل ہے۔ وحی الٰہی تو انسانی دسترس سے بالاتر قوانین سے متعلق ہوتی ہے طبعی قوانین تو انسان تجربہ اور تحقیقات سے خود دریافت کر سکتا ہے اور

حقیقت میں انسانی ترقی اور تمدن علم حاصل کرنے کی ایسی ہی کوشش کا نام ہے۔ جب عقل کُل عقل محدود سے خطاب کرتی ہے تو انسانی حدود کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے دیگر نہ اُس کا پیغام ہمارے فہم و فراست سے بالاتر ہوگا اور گنہگار بندے اُس سے دُور بھاگنا شروع کریں گے۔

قرآنِ کریم کے بعض مقامات اگر ان کے سباق و سیاق سے علیحدہ کر کے دیکھے جائیں تو سائنس کے خلاف نظر آئیں گے حقیقت یہ ہے کہ وہ حقائق ایک خاص وقت کی زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ آج کی زبان اُس وقت کون سمجھ سکتا تھا۔ اس کے خلاف بعض مقامات ہمیں انسانی علم کی انتہائی بلندیوں کا پتہ دیتے ہیں۔

میں صرف تین حوالہ جات پیش کر دوں گا۔

وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم ما فرطنا فی الکتاب من شیٔ ثم الیٰ ربھم یحشرون ٥

ترجمہ۔ نہیں ہے زمین میں کوئی جانور اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے پروں پر اُڑتا ہے مگر وہ ایک اُمت ہے تمہاری ہی جیسی۔ ہم نے اس کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی ہے اور وہ پھر اپنے رب ہی کی طرف دوبارہ جمع کئے جائیں گے۔

سبحٰن الذی خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض ومن انفسھم ومما لا یعلمون ۝

ترجمہ۔ تعریف اس ذات کی جس نے تمام جوڑے پیدا کئے از قسم ان چیزوں کے جو زمین اُگاتی ہے اور از قسم خود ان کی ذات کے اور از قسم ان چیزوں کے جن کا ان کو علم نہیں ہے"

سائنس کے تازہ ترین انکشافات میں سے ایک یہ ہے کہ ہر چیز کے جوڑے ہیں یہاں تک کہ پہاڑ اور بجلی میں بھی یہ بات موجود ہے اور میرے لئے باوجود میرے فہم سے بالاتر ہونے کے اہم ترین الفاظ تو یہ ہیں یہ اور تمہیں ایک ہی روح کے انداز پر جانچا جائیگا بنی نوع انسان کی روح یا شاید تمام مخلوقات کی روح

قرآن کریم نے بلا شبہ علم اور بالخصوص طبعیات کے
لئے ایک ذوق اور ایک تڑپ پیدا کر دی اور
جیسا کہ زمانۂ حال کے بعض مصنفین نے تسلیم کیا ہے
استخراجی طریق جو فی الحقیقت زمانۂ حال کے اہم اکتشافات
کی بنا ہے قرآنِ کریم ہی کا بتایا ہوا ہے۔ اس لئے
قرآنِ حکیم ہی کو زمانۂ حال کی سائنٹفک ترقی کا سرچشمہ
قرار دیا جا سکتا ہے۔

مسلمان اللہ کے نام پر اُس وقت تلاش علم میں
اُٹھے جب عیسائی دنیائے قدیم کے علوم کو حضرت
عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر تباہ کر رہے تھے اُنھوں
نے کتب خانۂ اسکندریہ کو برباد کر دیا تھا اور کتنے
فلسفیوں کو جن میں خوبصورت ہپیشیا بھی شامل ہے
موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ عیسائی کی نظر میں علم تو
شیطان کا ایک جال تھا جس میں کافر ہی پھنس سکتے
تھے اُن کے ہاں "علم حاصل کرو خواہ چین ہی میں ملے"
جیسی کوئی روشن ہدایت موجود نہ تھی۔ پادریوں نے
یونانی اور رومی علوم کے مخطوطات علانیہ نذرِ آتش

کر دیئے۔ مغربی رومی تو بربریت پر اُتر آئے تھے مشرقی رومی بادشاہوں نے بلاشبہ اپنے کتب خانے بھی قائم کئے اور بعض علمأ کی قدردانی بھی کی لیکن یہ سب کچھ شاہی محلّات کی چہار دیواری تک محدود تھا اور محلّات کے باہر کی وسیع دنیا پادری ہی کے تابع فرمان تھی۔ تاریخ اسلام ہمارے سامنے علم دوستی کا ایک دوسرا ہی منظر پیش کرتی ہے۔ خلیفہ المامون نے قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ پر بعض ماہر علمأ سے استفادہ اور بعض کتابوں کے حصول کی خاطر حملہ کر دیا۔ یہ علمأ اور یہ کتابیں قسطنطنیہ کے محلّات کی قید و بند سے نکل کر بغداد کی بدولت بنی نوع انسان کو اپنے فیض سے سیراب کر گئیں اُن علمار اور مسلمان علمأ کی باہمی کوششوں سے ان قدیم کتابوں کا ترجمہ شروع ہؤا اور اس طرح زمانۂ قدیم کے وہ گراں بہا جواہرات نہ صرف تلف ہونے سے بچ گئے بلکہ دُنیائے جدید کو ترکہ میں ملے۔

The Chemistry

کیمیا یا کیمسٹری

کیمسٹری میں جو تین چوتھائی کیمیا ہی تھی مسلمان سائنس داں مسلسل تجربات میں مصروف تھے اور اس سے بھی اہم امر یہ تھا کہ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کو ضبط تحریر میں لاتے اور ایک دوسرے سے نتائج کا مقابلہ کرتے تھے مسلمانوں سے پہلے سائنس کا جو کچھ علم تھا وہ سائنس داں اپنے سینے میں ایک راز کی طرح پوشیدہ رکھتے تھے مطلب یہ تھا کہ ان رازوں کا جاننے والا ایک صاحبِ کمال تسلیم کرلیا جائے اور اس کی شہرت ہو۔ برخلاف اس کے مسلمان سائنس داں اپنے نتائج شائع کرتے تھے اور باہمی اعانت اور مشورہ کی قدر کرتے تھے۔ وہ استخراجی طریق سے جو اُنھوں نے سب سے پہلے اختیار کرلیا۔ ہر مسئلہ کو بتدریج سمجھتے جاتے تھے۔ چھوٹی سی تفصیل پہ نتائج کی دُنیا آباد نہ کر لیتے تھے اور قدم قدم پہ اپنے مشاہدات ضبطِ تحریر میں لاتے جاتے تھے۔

موجودہ کیمسٹری یا علم کیمیا اور اُس کے تمام حیرت انگیز انکشافات کی بنا وہی مواد ہے جو مسلمان سائنس دانوں نے اس طرح جمع کیا۔ تیسری صدی ہجری کے ایک مسلمان ماہر کیمیا نے لکھا :-

"کیمسٹری میں سُنی سُنائی باتوں اور دعوے بے دلیل کے لئے کوئی گنجائش نہیں، یہ ایک اصول مسلّمہ ہے کہ کوئی کلیہ جس کے لئے ثبوت مہیا نہیں کئے جا سکتے۔ ایک دعویٰ بے دلیل ہے جو اگر درست ہو سکتا تو ساتھ ہی غلط بھی ہو سکتا ہے۔ جب کوئی اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ تمہارا کلیہ درست ہے"!

پہلی سات آٹھ صدیوں کے مسلمان علمأ کا یہ طرزِ عمل تھا اور سبھی تجربہ اور مشاہدہ کے حامی اور ثبوت کے طالب تھے۔

طبعیات

طبعیات میں بھی مسلمان سائنس دانوں کا طریق تجربہ

اور نتائج تجربہ کو ضبطِ تحریر میں لانا تھا۔ اُن میں بڑے بڑے ریاضی داں اور مہندس پیدا ہوئے اور ہم جانتے ہیں کہ وہی الجبرا کے موجد بھی تھے۔ عربی فارسی اور ترکی زبانوں کی کسی لغت کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے آپ کو اس امر کا کافی ثبوت مل جائے گا کہ وہ علم نباتات سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن آج بلا شبہ یہ علم اس درجہ کس مپرسی کی حالت میں ہے کہ آپ کسی عام پڑھے لکھے عرب سے کسی جنگلی درخت کا نام دریافت کریں تو وہ یا تو کہے گا کہ یہ ایک قسم کی گھاس ہے یا پھر ایک جاہلانہ حقارت کے ساتھ کہہ دے گا کہ یہ ایک خود رَو پودا ہے۔ عوام تو صرف اُن درختوں کے ناموں سے آشنا ہیں جن کا یا تو کوئی استعمال معلوم ہے یا جن کی خوشبو اُن کے مشامِ جان کو معطّر کر سکتی ہے۔

نیچرل ہسٹری یا تاریخ طبعی میں اُنہوں نے ارسطو کا اتباع کیا۔ ارسطو آج ہمارے لئے ایک نابینا رہنما ہے لیکن بلا شبہ اُس زمانہ میں وہی مشعلِ راہ تھا۔

مسلمانوں نے نیچرل ہسٹری میں بھی مشاہدات کئے اور
انہیں ضبطِ تحریر میں لے آئے اور اس طرح انہوں
نے نہ صرف سائنٹفک معلومات میں اضافہ کیا بلکہ
ساتھ ساتھ ہی ارسطو کی غلطیوں کی اصلاح بھی کرتے
گئے ہیں۔

جغرافیہ

مسلمانوں نے جغرافیہ کی بڑی خدمت کی ہے۔ اہلِ
عرب تجارت، سیر و سیاحت اور جہاز رانی میں اپنے
زمانہ کے امام تھے۔ انہوں نے اپنے سفر و سیاحت کے
مشاہدات پوری تفصیل سے قلمبند کئے۔ جن ملکوں سے
اہلِ عرب کے باقاعدہ تجارتی تعلقات تھے عربوں
نے نہ صرف اُن ممالک کے نقشے مرتّب کئے بلکہ
وہاں کی آبادی کی سیاسی، معاشری اور تجارتی تفاصیل
قلمبند کیں اور اُن کی نباتات اور حیوانات اور درآمد و
برآمد سے متعلق معلومات کا نہ صرف ایک نادر اور
وافر ذخیرہ مہیا کیا بلکہ دوسرے ممالک کے ان حالات

کا مطالعہ اپنے ہاں مکاتب میں داخل درس کر دیا۔

طب

طب عملی و نظری میں اُن کے کمالات مسلّم تھے
یونانی طب اور یونانی حکمت جو عربی میں منتقل اور عربوں
کے تجربات اور مشاہدات عملی سے مالا مال ہوئی صدیوں
مشرق و مغرب میں رائج اور مسلّم رہی، مسلمان اطبّا ہی
نے سب سے پہلے تازہ ہوا کی خوبیاں اور صفائی کے
فوائد بیان کئے۔ مسلمانوں ہی نے سب سے پہلے شفاخانے
قائم کئے جن میں مریضوں کی تقسیم اُن کے امراض کے
لحاظ سے علیحدہ علیحدہ وارڈوں میں عمل میں آئی۔
شفاخانوں میں مسلمانوں ہی نے تازہ ہوا اور صفائی کو
علاج کا مرتبہ دیا۔ انّ شفاخانوں میں مریض کے
آرام و آسائش کو سب باتوں پر مقدم سمجھا جاتا ہے۔
اٹھارہویں صدی میں ترکوں نے یورپ کو زمانہ
قدیم کے اس خیال سے دوبارہ روشناس کرایا کہ
تبدیل آب و ہوا اور معدنی چشموں کا پانی صحت کے

لئے مفید ہیں۔ اٹھارہویں صدی ہی میں ترکوں کی وساطت سے یورپ کو ٹیکے کا علم ہوا۔ یہ خیال بھی اُن مفید چیزوں میں سے تھا جو سٹوارٹ وارٹلے مانٹیگو ٹرکی سے لایا جس کے مکاتیب، ترکوں کی بربریت کے متعلق زبان زد خلائق داستانوں کی تکذیب کے لئے کافی ہیں۔

فلکیات

مسلمانوں کی فلکیات کا غالب حصہ علم نجوم تھا لیکن وہ اپنی رصدگاہوں کو ایک معقول حد تک قابل اعتماد آلات سے آراستہ رکھتے تھے اور اپنے مشاہدات کو پوری احتیاط سے ضبطِ تحریر میں لاتے تھے ہسپانیہ اور سمرقند کی رصدگاہیں مسلمانوں کی بہترین اور معروف ترین رصدگاہوں میں شمار ہوتی تھیں۔

ماہرین فلکیات سیاحوں، جغرافیہ دانوں اور ریاضی دانوں سے اپنے مشاہدات کے اندراجات کا مقابلہ

کرتے تھے اُن کے متفقہ مشاہدات کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف ہسپانیہ کی اسلامی یونیورسٹیوں میں تو کرۂ دوّار تک موجود تھا اور دوسری طرف برونوکر احتساب مذہبی کے ماتحت کوپرنیکس کے نظریہ گردش زمین پر اعتقاد رکھنے کی بنا پر آگ میں جلایا گیا اور اس سے پہلے گلیلیو کو نہایت بے رحمی سے اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ اس امر کا تحریری اعلان کرے کہ انجیل کی تعلیم کے مطابق زمین ساکن ہے کہا جاتا ہے کہ جب گلیلیو کا قلم اِس اعلان باطل پر طوعاً و کرہاً دستخط ثبت کر رہا تھا تو اُس نے دبی زبان سے یہ اعلان بھی ساتھ ہی کیا کہ " زمین گردش تو ضرور کرتی ہے "۔ ہسپانیہ کی اسلامی یونیورسٹی کی تعلیم کی بدولت ہی کولمبس کو زمین کے گول ہونے کا خیال پیدا ہوا اگرچہ اُسے بھی بعد میں تعزیر مذہبی کے ذریعہ اس خیال سے توبہ کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جب ہم اس فراموش شدہ تاریخی حقیقت کی یاد تازہ کرتے ہیں کہ ہسپانوی اسلامی یونیورسٹیوں نے خلیفہ عبدالرحمٰن

ثالث کے زمانہ میں اور مشرقی اسلامی یونیورسٹیوں نے
المامون کے عہد میں اور میں صرف ان دو فرمانرواؤں
کا حوالہ محض اس لئے دے رہا ہوں کہ اُن کے
متعلق صراحت کے ساتھ یہ تذکرہ موجود ہے عیسائی
اور یہودی طلبا کے لئے بھی مسلمان طلبا کے ساتھ ساتھ
علم و حکمت کی تحصیل کے دروازے پوری کشادہ دلی
سے کھول رکھے تھے بلکہ اُن کے قیام و طعام کے
مصارف بھی ان اسلامی یونیورسٹیوں کے ذمے تھے
اور اس طرح سینکڑوں عیسائی طلباً جنوبی یورپ اور
مشرقی ممالک سے پادریوں کے پنجے سے بھاگ بھاگ
کر اسلامی دعوت تحصیل علم کے دامن میں پناہ لیتے
تھے تو ہم بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ یورپ کی
موجودہ ترقی کس درجہ اسلام کی مرہون منت ہے
عیسائی چرچ کا تو زمانہ حال کی ترقی پر اتنا احسان
ضرور ہے کہ وہ علماً پر طرح طرح کے مظالم توڑتا
تھا اُن کو گوناگوں اذیتیں پہنچاتا تھا بلکہ انہیں زندہ
جلا دیتا تھا۔

آرٹ

آئیے اب ہم آرٹ کی طرف متوجہ ہوں اس قدر متفق علیہ ہے کہ مصوری اور نقاشی کو تمثال طبعی ہی تک محدود رکھا گیا ہے کیونکہ جان داروں کی تمثال کے ساتھ بُت پرستی وابستہ تھی مجھے قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی میں کوئی صریح حکم نظر نہیں آتا۔ اس قدر البتہ ضرور مسلّم ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایرانی مصور کی اس درخواست کو کہ اُسے حضور نبیِ کریمؐ کی ایک تصویر بنانے اور اُس تصویر کو ایران میں لے جانے کی اجازت دی جائے اس اندیشہ سے کہ مبادا کسی وقت اُس کی پرستش شروع ہو جائے شرفِ قبولیت نہ بخشا۔

تصویر کشی اور مرقع نگاری کو تو عیش پرست ایران اور اس کے زیرِ اثر ممالک میں اور وہ بھی اسلامی تہذیب کا زوال شروع ہو جانے کے بعد مسلمانوں میں فروغ حاصل ہوا اور اگرچہ بعض صدیوں میں آرٹ سے

متعلق حیرت انگیز نتائج پیدا ہوئے لیکن انہیں اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ موسیقی اور ڈراما کو بھی مسلمانوں نے مشرکانہ عبادات کے ساتھ وابستگی کی بنا پر حقیر فنون سمجھا اور انہیں اپنی سرپرستی سے محروم رکھا۔ عوام کی مسرت نے موسیقی کو زندہ تو ضرور رکھا لیکن اسے بھی لہو لعب ہی کا ایک جزو سمجھا گیا اور آرٹ کا مرتبہ تو اسے بمشکل ہی دیا گیا ہے۔ دنیائے اسلام میں سب سے معزز موسیقار تو مؤذن تھے اور انہیں حد درجہ اعزاز و احترام حاصل تھا اور جب کبھی تقریبات میں انہیں آمادہ کیا جاتا تھا تو انہیں نہایت معقول معاوضہ پیش کیا جاتا تھا اور اُن کا گانا بھی عام گویوں سے بہت بہتر ہوتا تھا۔

پہلے زمانہ میں تو دنیائے اسلام کے طول و عرض میں ایک روح موسیقی اور ایک نغمہ جاری و ساری تھا لیکن یہ اُن لوگوں کی موسیقی تھی جو بانسری اور ستار پر محض خوشی کے لئے گاتے تھے اُن کا گانا وہ بھاری بھرکم ہنر نہ تھا جسے آج یورپ موسیقی کے نام سے یاد

ہوتا ہے۔

ڈراما

ڈرامے کو تو مسلمانوں نے اس لئے لائق توجہ ہی نہ جانا کہ اُن کے خیال میں بھیس بدلنا اور بہروپ بھرنا مسلمان کے شایانِ شان نہیں اور مسلمان عورت کے لئے تو یہ نہایت ہی حقیر فعل ہے ڈرامے کو ایک ذلیل حالت میں یونانیوں اور آرمینیوں کی سفری ٹولیوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا۔

ڈرامے کے بجائے اسلامی دُنیا میں ایسے تماشے رائج تھے جو مجامع عام اور تقریبات خاص میں دکھائے جاتے تھے اور اُن کی نوعیت نہایت ہمہ گیر تھی اور اُن کو اس درجہ مکمل کیا گیا کہ صرف نہایت ہی فہیم لوگ ان سے لطف اندوز ہو سکتے تھے اس قسم کے تماشوں کا حوالہ خیام کی ایک رباعی میں بھی موجود ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "ہم جادو کے تماشہ کی متحرک تصویروں کی طرح ہیں جو تماشا کرنے والے کے روشن

فانوس کے اندر چکر لگاتی ہیں "

لفظ خیام جس کے معنے "تنبو بنانے والا" ہیں، ہمیں اسلامی تہذیب کے ایک اور ترقی یافتہ آرٹ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ خیموں کے اندر کشیدہ کاری کی صورت میں فن آرائش نے اپنی رنگینی پرہنری اور دلفریبی کے اعتبار سے ایک بلند مرتبہ حاصل کر لیا۔ خیامین یعنی خیمہ دوز۔ اور سینٹ پال ایک عالم یہودی انہی میں سے تھا، تاجر اور سوداگر ہی نہ تھے بلکہ اپنے تخیل اور کاری گری کے لحاظ سے استادان فن میں شمار ہوتے تھے۔

میں نے خود بہت سے ایسے تماشے دیکھے ہیں۔ گذشتہ صدی کے آخری عشرہ میں وہ ایشیائے کوچک شام اور مصر میں رائج تھے۔ اگرچہ وہ عوام کے ہاتھوں پڑ چکے تھے لیکن میں اس امر کی شہادت دے سکتا ہوں کہ وہ بڑا ہی کمال دکھاتے تھے اور تماشا کرنے والے بڑے ہی دانا اور زندہ دل ہوتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے جو تماشے دیکھے نہایت ہی پر لطف تھے۔ اسلامی

تہذیب میں ڈراما کا ظہور انیسویں صدی کے آغاز سے ہوا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں نے ترکی اور ایران میں بعض بہت اچھے ناٹک لکھے لیکن ان کے تمام اداکار یہودی اور آرمینیہ کے لوگ ہوتے تھے۔ بعض نہایت ہی ہنگامہ خیز ڈرامے جو ادب کا درجہ رکھتے ہیں دمشق کے ایک عالم شیخ نے لکھے تھے جن کے مضامین اسلامی تاریخ اور زندگی سے ماخوذ تھے۔ ان میں مجھے یاد ہے ایک نہایت شاندار تاریخی ڈراما صلاح الدین ایوبی، اور ایک شاعرانہ اور پُرسوز ڈراما عفیف تھا۔

داستان گوئی

موجودہ مغربی تہذیب میں جو حیثیت ایک مقبول خلاق ایکٹر کو حاصل ہے وہ تہذیب اسلامی میں شہرۂ آفاق داستان گو کو حاصل تھی۔ داستان گو ایک اوّل درجہ کا آرٹسٹ ہوتا تھا اس جماعت نے اپنے ہنر سے ایسی دل نشیں، حیرت انگیز اور نصیحت آموز قصوں کی دنیا قائم کر دی جس کا روز مرہ کی زندگی سے نہایت گہرا

تعلق تھا۔ داستان گوؤں کے ہنر کے نتائج کتابی صورت
میں مرتب ہو چکنے کے بعد مشرق میں ادب کے درجہ
تک پہنچ گئے۔ اگرچہ خال خال کہیں پڑھے لکھے ادیبوں
نے انہیں خالص عربی طرز کی افسانہ نگاری یعنی مقامات
کے مرتبہ تک پہنچانے کی کوشش کی۔ مقامات کا قریب
قریب وہی مفہوم ہے جو 'سمر' کا ہے اور 'سمر' ایسے
قصے کہانیوں کو کہتے ہیں جو عوام کی تفریح و مسرت
سامان ہوں۔ دونوں الفاظ کے معنے تفریح کے لئے
راتوں بیٹھنا ہے لیکن مقامہ کے معنے ہیں امراء کے
دولتکدوں پہ تفریح کے لئے رات کو بیٹھنا اور 'سمر'
کے معنے ہیں قہوہ خانوں یا گلیوں کے نکڑوں پر تفریح
کے لئے رات کو مجلس آرائی کرنا۔ جب میں پہلی مرتبہ
قاہرہ اور دمشق گیا تو 'مقامہ' اور 'سمر' دونوں وہاں
رائج تھے۔ الحریری نے اپنی مشہور و معروف تصنیف
'مقامات' کا خیال اور اپنے مشہور بدمعاش ہیرو کا نام
ابو زید الحجازی سے کہ سفری داستان گوؤں میں ممتاز تھا
لیا ہے بہترین اور معروف ترین سلسلہ تو الف لیلہ ولیلہ

کے نام سے مشہور ہے جسے مغرب میں عربی ادب کا
اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

ولفرڈ بلنٹ نے اپنی کتاب "گھوڑی کی چوری" میں
ابو زید کے سلسلۂ قصص ہی کے ایک حصّہ کا ترجمہ کیا
ہے لیکن اس قسم کے اور بہت سے سلسلے ہیں جن
میں بعض اب عربی میں شائع ہو چکے ہیں مثلاً عہد جاہلیت
کے شاعر ہیرو عنترہ جسے عرب کا ہرقلیس مانا جاتا تھا
اور اسی طرح سیف بن ذی یزن یعنی اُس بطریق کا
سلسلہ تصانیف جو دریائے نیل کو قاہرہ سے آیا
وغیرہ وغیرہ۔

اگر روایت خلاف واقعہ نہیں تو عنتر کی تصنیف
ایک ادبی مرقع ہے۔کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مصر کے
ایک بادشاہ کے محل میں کوئی شرمناک حرکت عمل میں
آئی اور قاہرہ کی گلیاں اس واقعہ سے متعلق جستجو اور
تشہیر کے شوق میں عوام کے ہجوم سے تماشا گاہیں
بن گئیں تو بادشاہِ وقت نے عوام کی توجہ کا رُخ
کسی دوسری طرف پھیر دینے کے لئے اپنے زمانہ کے

بہترین مصنف سے فرمائش کی کہ وہ ایک دلچسپ قصہ مرتب کرے اور داستان گوؤں میں تقسیم کرے اُس نے عرب کے ہیرو شاعر عنترہ کا قصہ منتخب کیا جس کی نظم دل افروز کا مطلع ملاحظہ ہو۔

هل غادر الشعراء من مستردم
ام هل عرفت الدار بعد توهم

اس کا شمار عرب کے سات بہترین قصائد (معلقات) میں ہوتا ہے اُس نے اپنے قصہ کو ایک طویل سلسلہ کی صورت میں مرتب کیا جس سلسلہ کی ہر کڑی نہایت ہی شوق انگیز اور صبر آزما مقام پر ختم ہوتی تھی مصنف ہر روز اس سلسلہ کی ایک ایک قسط قصہ گوؤں کو بہم پہنچاتا جاتا تھا اور وہ ہر روز ان لوگوں کو جو اُن کی مشعلوں کے گرد رات کو جمع ہو جایا کرتے تھے سُنا کر مسحور کرتے جاتے تھے اس سلسلہ کی دلکشی نے جلد ہی شاہی محل کے واقعہ رسوائی کی یاد دلوں سے محو کر دی اور عوام اس نئے افسانہ میں اُلجھ کر رہ گئے۔ ایک شخص کے متعلق جس نے عنتر کے

قصّہ کو دمشق کی گلیوں میں قاہرہ میں اس کی تصنیف
کے سینکڑوں برس بعد سُنا کہا جاتا ہے کہ وہ اُس
رات اس سوچ و فکر میں بالکل نہ سو سکا کہ عنتر کا
اپنے دشمن ایرانیوں کے ہاتھ پڑ کر کیا حال ہُوا ہوگا
اور وہ کس طرح بھاگ نکلا ہوگا۔ داستان گو نے
قصّہ کو ایک حد درجہ شوق انگیز اور صبر آزما مقام پر
اسی طرح ختم کیا جیسے آج کل کے سلسلہ وار کہانیاں
لکھنے والے کرتے ہیں۔ اُس شخص کی حیرت اور شوق
و بیتابی کی یہ حالت تھی کہ وہ آدھی رات کو
داستان گو کے گھر پہنچا اُسے جگایا۔ انعام پیش کیا اور
اپنے تسکین شوق کے لئے کہانی کا اگلا حصّہ سُنا
تب کہیں جا کر اُسے چین آیا اور نیند نصیب
ہوئی۔

یہ قصّے کہانیاں جن میں متداول روایات اور
ادب کی سرحدیں مل جاتی تھیں مسلمانوں کے لئے تفریح
کا سامان تو ضرور تھیں لیکن مسلمانوں نے انہیں حقیر جانا
اور جاہلوں اور ہرزہ پسندوں کے لئے مخصوص سمجھا۔ لیکن

آج ہم ان چیزوں کو اس حقارت سے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ ان ہی چیزوں کو آج ہم مغرب میں ادب کی ایک نہایت ہی اہم صنف یعنی افسانہ نگاری کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔

تعمیرات

اسلامی تہذیب کے تعمیراتی کمالات کے متعلق کیا عرض کروں۔ قرطبہ کے بڑے بڑے گرجا سے لے کر دیوارِ سمرقند تک۔ الحمراء سے تاج تک دجلہ کے اُس پار ایک اُونچی پہاڑی پہ ایک ولی اللہ کے مقبرہ سے قاہرہ اور قیروان کے گنبدوں اور یروشلم میں چٹان کی چھت تک جسے حال ہی میں ایک جرمن ماہر نے موجودہ دنیا کی بہترین عمارت قرار دیا ہے۔ اُن ممالک کی طرح جو مسلمانوں کے زیرِ نگیں آئے یہ یادگاریں تعمیر کے گوناگوں نمونے پیش کرتی ہیں وہ تمام تعمیریں اسلامی ہیں اور ہر عمارت میں ایسے نمونے موجود ہیں جو اقوامِ عالم کو انگشت بدنداں

کرنے کے لئے کافی ہیں۔ مساجد۔ محلات۔ قلعے۔ مکانب۔ شفاخانے۔ تفریح گاہیں اور باغات کس چیز کی کمی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اسلامی فن تعمیرات نے شیدائیاں حسن و جمال کے لئے ایک ہمہ گیر اور لازوال جنت نگاہ مہیا کر دی ہے، اپنے بھلے دنوں میں مسلمان بھی حسن و جمال کے دل دادہ تھے نقشہ کی خوبی۔ ڈیزائن کی عمدگی اور رنگوں کی کشش سبھی کچھ اُن کے پیشِ نظر تھا۔ چونکہ بت پرستانہ صورتیں گوارا نہ تھیں اُنہوں نے حسنِ فطرت پر بہت زیادہ توجہ کی مسلمانوں کی تعمیرات میں ایک لطیف خوش ترتیبی اور فطرت کے ساتھ ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے اسلامی عمارتیں اپنے ماحول سے پوری پوری مطابقت رکھتی ہیں۔ اُن کی محراب دار عمارتوں کی خوبصورتی اور مسقف بازاروں کی دلفریبی، چٹانوں یا ساحل سمندر کی غاروں کے مشابہ ہے جن میں سازو سامان کی چمک دمک اندرونِ سمندر کی اشیا کی جھلک کے ہم پایہ نظر آتی ہے۔

سایہ میں سادگی اور وقار، دھوپ میں رنگینی۔

مضبوطی، نزاکت، شان و شکوہ اور حسن و شوکت دنیا بھر میں تعمیرات اسلامی کے بھی خصائص امتیازی ہیں، اس تیرہ خاکدان کو عرب خلفاء، ترک سلاطین اور مغل شہنشاہوں سے بہتر تعمیرات کے مربی۔ باغات کے شیدائی اور مناظر کے دلدادہ کبھی نصیب نہیں ہوئے، تاج محل کی حقیقت سے آپ سب واقف ہیں لیکن اشبیلیہ کے بادشاہ معتمد کے قصہ سے ممکن ہے آپ میں سے بعض ناواقف ہوں کہ اُس نے اپنی ملکہ کی مسرت کے لئے کیا اہتمام کیا۔ ایک مرتبہ دورانِ سفر میں ملکہ اعتماد نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے طوفان کی خوبصورتی کو سراہا تھا معتمد نے قرطبہ کی تمام بالائی پہاڑی کو بادام کے درختوں سے اس طرح ڈھانپ دیا کہ ہر موسم بہار میں ملکہ پھولوں سے کھلے ہوئے جنگل میں پہاڑ پر برف کے طوفان کے نظارہ سے لطف اندوز ہو سکے ترکی اور ایرانی باغات کی دلفریبی کی یاد انسان کے دل سے کبھی محو نہیں

ہو سکتی اور ہیں باغات کو تعمیرات ہیں اس لئے
شمار کرتا ہوں کہ پرانے یونانی باغات کی طرح
مسلمانوں کے باغات بھی عمارات کے انداز پر ترتیب
دیئے جاتے تھے۔

خوش نویسی

مسلمانوں نے خوش نویسی میں نہایت ہی نادر اور
دلفریب انداز پیدا کئے۔ خوش نویسی کے ان حسین
نمونوں کا وجود کلیتہً فن مصوری پر قیود کا مرہونِ منت
ہے، پچی کاری کا فنِ جمیل اور پتھر میں خوبصورت
پھول پتی کی نقاشی بھی جو اسلامی تعمیرات کا طرۂ
امتیاز ہیں مصوری پر پابندی کی بدولت معرضِ وجود
میں آئی ہے۔

عرب میں ظہور اسلام سے پہلے شعر یعنی ادب
کی ایک ہی صنف کا وجود تھا۔ زمانہ جاہلیت کے
عربوں کی شاعری نہایت ہی بلند پایہ تھی اور بعض
مستشرقین سبعہ معلقات کی بنا پر عہد جاہلیت کے چند

شاعروں کو عہد اسلامی کے ہزاروں شاعروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ چرواہے کی بانسری کو ایک دلفریب آرکسٹرا پر ترجیح دینے کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے۔ میرا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہے۔ عہدِ جاہلیت کی شاعری میں ایک سوز و گداز ہے جس کا مجھ پر بے حد اثر ہے لیکن بہ لحاظ وسعت و ثقافت عہدِ جاہلیت کے شعرا کا امرؤالقیس، عنترہ، کعب بن زہیر ابوطیب المتنبی یا کسی دوسرے بڑے اسلامی شاعر سے کیا مقابلہ ہے۔ تہذیب اسلامی میں شاعری معدودے چند لوگوں کے لئے کوئی عطیہ خدا داد نہ تھا یہ تو تمام لوگوں کے لئے سرمایۂ تفریح و مسرت تھا شعرا کی اس قدر کثرت تھی کہ اعلیٰ درجہ کے عربی ایرانی اور ترکی شاعروں کے ناموں کی صرف فہرست ہی تیار کرنے کے لئے کئی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی۔

تراجم

مسلمانوں نے قدیم یونانی اور لاطینی کتابوں کے جو

تراجم کئے اور اُن کی جو شرحیں لکھیں اگرچہ وہ بجائے خود ایک شان دار کارنامہ ہے جس کی بدولت بنی نوع انسان کی بڑی خدمت انجام پائی اور جن تراجم کی بدولت علم قدیم کی مشعل ہزار سال تک یورپ میں روشن رہی اگرچہ ان تراجم کی فہرست نہایت ہی طویل ہے لیکن میں انہیں تہذیب اسلامی کی مخلوق نہیں سمجھتا اخلاق پر تصانیف کی اس قدر کثرت ہے کہ اخلاقیات ادب کی ایک جداگانہ صنف قرار پا گئی ہے جس کا نفس مضمون اور طرز بیان تقلیدی ہے عربوں کو اس کا ہمیشہ شوق رہا اور الفاظ کی دل نشین اور پُر شکوہ زیر و بم کے وہ ہمیشہ دلدادہ رہے۔

فن خطابت اور علم منطق پر جو کتابیں موجود ہیں اُن کا مطالعہ آج بھی لطف و سود مندی سے خالی نہیں۔

فلسفہ پر مسلمانوں نے کثرت سے دلچسپ تصانیف چھوڑی ہیں جن میں سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح بہت سی آج بھی ہمارے عمیق ترین مطالعہ

کی سزاوار ہیں۔

تاریخ

تاریخ کو تو گویا مسلمانوں نے ہی پروان چڑھایا ہے۔ مسلمانوں سے پہلے تاریخ جیسا کہ یورپ میں اس کا مفہوم تھا خاندانوں۔ سالوں اور جنگوں کے نقشوں سے کچھ زیادہ نہ تھی جنہیں طالب علم کے حفظ کرنے کی خاطر آسان صورت میں مرتب کر دیا جاتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی بدولت دُنیا کا دامن علم آج متعدد ایسی کتب تواریخ سے مالا مال ہے جن میں ایسی تفاصیل اور جزئیات موجود ہیں جن سے متعلقہ زمانے کے رسم و رواج اور فطرتِ انسانی سے متعلق معلومات مہیا ہیں۔ اور جن سے مصنفین کی وسیع النظری اور آزاد خیالی کا پتہ چلتا ہے۔ ان عرب مؤرخین میں سے جنہوں نے میرے لئے سامان دلربائی مہیا کیا ہے ابن عمارہ جو یمن میں زبید اور صنعا کا مؤرخ ہے اس کے بعد کتاب الفخری ہے پھر ابن الاثیر ہے

اور اُن کے بعد ابنِ خلدون کا درجہ ہے جس کا نظریۂ تاریخ اس قدر جدید ہے کہ اُسے پڑھتے وقت انسان بھول جاتا ہے کہ وہ چند صدیوں پہلے کی کسی تصنیف و تاریخ سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

احمد الجبرتی مؤرخ مصر کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جس کی ضخیم تصانیف حد درجہ دلچسپ ہیں اُس نے مصر پہ فرانسیسی قبضے اور محمد علی کے حصول اقتدار کا زمانہ پایا۔ ان مصنفین کو یورپ والے لا دینی مؤرخین کے نام سے یاد کریں گے۔

ان کے علاوہ مسلم مؤرخین کی ایک کثیر جماعت ہے جس کی کاوشیں تاریخ اسلام ہی کی ترتیب و تدوین کے لئے وقف رہی ہیں۔ یوں تو اسماعیل ابوالفدا پر فریفتہ ہوں زیادہ سرور انگیز مصنفین میں سے سب سے مجھے مجدو الدین مؤرخ یروشلم سے شیفتگی ہے۔

مسلمانوں نے بہت سے سفرنامے بھی لکھے ہیں جن میں سے آج ابن بطوطہ سب سے زیادہ مشہور ہے اگرچہ افادہ و دلکشی کے اعتبار سے وہ صف اوّل

میں جگہ حاصل کرنے کا حقدار نہیں

مخصوص اصناف ادب

اب میں اُن اصناف ادب کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جن کا وجود ادب اسلامی کے باہر ناپید ہے میری مراد مجموعہ احادیث قدسی سے ہے۔ حضور سرور کائناتؐ کے ارشادات کے مجموعے معرّا بھی ہیں اور با ترجمہ بھی۔

ان تصانیف کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے جمع کرنے والوں نے جو کچھ سُنا اُسے جانچا اور پرکھا اور ایسی روایتوں کو رد کر دیا جو اُن کے معیار پر پوری نہ اُترتی تھیں۔ پہلے جمع کرنے والوں کے کام کو بعد میں آنے والوں نے پرکھا اور جانچا۔ ہر حدیث کے لئے اسناد بیان کی گئیں اور اگر کسی حدیث کی تائید میں کوئی خامی پائی گئی تو اُسے ضعیف قرار دیا گیا۔ چھ کتب احادیث کو سُنّی مسلمان معتبر مانتے ہیں اُن میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم مشہور ترین ہیں۔

فقہ

مسلمانوں کے ادب کی ایک دوسری معروف نثری صنف فقہ ہے جو اصولِ حکومت۔ سیاسی اور معاشری قوانین اور روز مرہ کے اعمال و کردار سے متعلق قوانین ہیں جن میں مثالیں دے کر سمجھایا گیا ہے۔ اس میں عبادات سے بھی مفصّل بحث ہے مثلاً نماز میں کس طرح ہاتھ باندھنے چاہئیں۔ یہاں تک کہ میاں بیوی کے درمیان حدود اختلاط سے بھی بحث ہے۔ یہ علم اُس خاص مُلائیت کی تخلیق ہے جسے بعض نے اسلامی ادارات کے تنزّل کا سبب قرار دیا ہے۔
فقہا کا منشاً یہ تھا کہ اس دُنیا کی روشنی کے بغیر قرآن کی کاملیت ثابت کریں۔ انہوں نے پوست کو لیا اور مغز کو چھوڑا۔
چھوٹی چھوٹی باتوں میں موشگافیوں کا وہ زور دکھایا کہ اُن کے بعض مباحث آج کل درخور اعتنا ہی نظر نہیں آتے۔ لیکن جیسا کہ غلطی سے بعض لوگوں کا

خیال ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

فقہ تو علم کے ایک ایسے میدان کا نقشہ سمجھنا چاہیئے جس پر مسلمانوں کی کامرانی موقوف ہے جس طرح کیمیا کی جستجو کا نتیجہ کیمسٹری کے سے مفید خلائق علم کی بنیاد کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح ایک غلط مقصد یعنی مسلمانوں کی باقی دُنیا سے علیٰحدگی۔ اور دین و دُنیا کے درمیان اُس دیوار کو دوبارہ قائم کر دینے کی سعی میں جسے اسلام نے ڈھا دیا تھا فقہا نے اپنی مغز سوزی سے اس طویل مدت میں تعلیماتِ اسلامی کا ایک سمندر کھنگال ڈالا اور اُس کے موتیوں اور سیپیوں کی حد بندیاں کر دیں۔ قوانین فقہ کبھی جامد و ساکت نہیں رہے۔ اُن میں زندگی اور حرکت موجزن رہی ہے۔ محض اس حقیقت کا اعتراف ہی فقہ کو مسلمانوں کی متاعِ عزیز کا درجہ دلوانے کے لئے کافی ہے۔

گرامر

عربی گرامر ایک وسیع صنف ادب ہے جو مسلمانوں

کے نزدیک علوم کاملہ میں سے ہے یہ جیسا بعض
لوگ سمجھتے ہیں ایک روکھا پھیکا مضمون نہیں اس کی
دلکشی کا تو یہ عالم ہے کہ جن چند مستشرقین نے اس
سے راہ و رسم پیدا کی انہیں اس کی خاطر اپنی زندگیاں
وقف کر دینے میں تامل نہ ہوا۔ اُن تمام قوموں میں
سے جنہیں اسلام کی حلقہ بگوشی کی سعادت نصیب ہوئی
کسی قوم کی زبان کی ہیئت میں عربی کی سی گہرائی اور
استحکام نہیں پایا جاتا لہذا اُن میں سے کوئی زبان اُس
شدید جائزے کی متحمل نہیں ہو سکتی جو اس زبان
کا لیا جا رہا ہے اور اس پہ لطف یہ کہ جائزہ
کا مواد جوں کا توں بر قرار ہے۔ اس زبان کے
ہزاروں کرشمے ہیں کہ دامن دل کھینچتے چلے جاتے ہیں
سینکڑوں خوبیاں ہیں کہ دماغ کے سامنے اُبھرتی چلی
آتی ہیں۔ اس سلسلہ میں نئے حل طلب مسائل پیدا
ہوتے رہتے اور نئے انکشافات کا وسیع میدان
سامنے رہتا ہے۔ مسلمان قوموں میں سے صرف ترک
ہی ایک حد تک عربی گرامر کو اختیار کر سکے ہیں

اور اس کی زیادہ تر وجہ ترکی زبان میں افعال بالخصوص مصادر کا حیرت انگیز نظام ہے۔

اس علم کو مطالعہ اور فہم قرآن سے قریبی تعلق کی بنا پر مسلمان قوموں میں ایک خاص منزلت حاصل رہی ہے۔ براوننگ نے انگریزی گرامر داں کو اپنی نظم "گرامر دان کا جنازہ" میں جو منزلت بخشی ہے وہ کسی عربی نحوی کے جنازے پر کسی مسلمان شاعر کی نظم کا نہایت ہی موزوں موضوع ہو سکتا ہے۔ عربوں کی صرف نحو کے مبسوط علم کے مقابلے میں تو اہل یورپ بالخصوص ہم انگریزوں کے پاس گویا گرامر کا عدم اور وجود برابر ہے۔"

تصوّف

اس نہایت ہی دلکش اور وسیع موضوع پر میں نے محض چند حوالوں پہ اکتفا کیا ہے اب اختتام پہ میں ادب کی ایک اور صنعت کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں اور یہ صنعت خود نہایت وسیع اور متعدد شاخوں

پر منحصر ہے۔ میری مراد تصوّف سے ہے جس کی
وساطت سے انسان اس دُنیا میں خدا سے براہِ راست
رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ عہدِ جدید کے بہت سے
یورپین مصنفین تو خود خدا کے وجود ہی کو محلِ نظر
سمجھتے ہیں۔ مسلمان ایسا نہیں سمجھتا کیونکہ خدا پر اُس
کا ایمان محض اُس کے اعتقاد کی وجہ ہی نہیں اُس
کے ذاتی تجربہ اور احساس پر بھی موقوف ہے۔ اور
صوفیا نے اس تجربے کو اس ناقدانہ صحت کے ساتھ
بیان کیا ہے کہ علومِ طبعی کی ریسرچ سوسائٹی بھی اُس
سے مطمئن ہو جائے گی۔

آج جب کہ مغربی دُنیا عالمِ ارواح کے مظاہرے
اور اُس کے ساتھ رشتہ قائم کرنے میں دلچسپی لے
رہی ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ علم طبعی اُس سے زیادہ
توجہ کا حقدار ہے جو اس کے حصّے میں آ رہی ہے
اور میں اسے ایک طبعی سائنس ہی سمجھتا ہوں جس
کا منشا انسان کے مرتبے میں بُلندی اور اُس کے
ذہن کی گیرائی اور رسائی کو وسعت بخشنا ہے اور یہی

ہر سائنس کا مقصد ہے۔ بہترین فلسفہ اور حکمت، عمیق ترین تخیلات اور وجد انگیز نظمیں جو اسلامی ثقافت کی تخلیق ہیں اس صنفِ ادب میں موجود ہیں۔ میں ذاتی طور پر عربی اور ترکی تصوف سے واقف ہوں۔ عجمی تصوف زیادہ مشہور ہے اور زیادہ تر اسی کا ڈھول پیٹا جاتا ہے لیکن عرب تو اس کے غالب حصے کو محض تخیل کی پرواز قرار دے کر رد کر دیں گے۔ اہلِ عرب کی نظر میں عجمی تصوف میں خیال کی وہ سنجیدگی۔ متانت اور صحت جو اس قدر ارفع مضمون کے لئے لابد ہے نہیں پائی جاتی۔ بلا شبہ عجمی صوفیوں میں سے بعض راہ راست سے منحرف ہو کر لوگوں کی گمراہی کا موجب ہوئے عربی تصوف نے کبھی ایسی صورتِ حال پیدا نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران اپنی گوناگوں ثقافت اور پر شکوہ شاعری کے باوجود غیر اسلامی تصوف کا مرکز رہا ہے۔ عجمی تخیل حقیقت کی قربانی پر بھی لطف و سرود کا طالب ہے بخلاف اس کے عربی اور ترکی دل و دماغ پاس کی

تلخیوں کے باوجود حقیقت کے جویا ہیں - حقیقی تصوف شریعت کی روح ہے اور نیک نہاد صوفیا نے اُس زمانے میں روحِ شریعت کو زندہ رکھا جب مسلمانوں کی اکثریت کو محض قانونِ شریعت ہی نظر آتا تھا -

مغربی علم ارواح کے جاننے والوں میں اس سادہ اور متین یعنی عربی طرز کے تصوّف کے مطالعہ کی سفارش کروں گا۔ کیونکہ یہ لوگ حیات بعد الممات کی شہادت مہیا کرنے کے لئے مردوں کی روحوں سے ربط پیدا کرنے کی حقیر کوشش کرتے ہیں تصوّف کا مطالعہ اُن پر واضح کرے گا کہ صرف ایسے مردوں کی روحیں اُن کے بلاووں کا جواب دے سکتی ہیں جن کے گناہ انہیں مرنے کے بعد کچھ مدّت کے لئے اس دُنیا سے ایک طرح مربوط رکھتے ہیں۔ اس سائنس کا مطالعہ اُن میں بلند تر مقصد پیدا کر سکتا ہے اور انہیں کتنی ہی ناکامیوں اور مایوسیوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے ٭

اسلامی ادب اور فنون تو تاریخ اسلام کے تاریک ترین ادوار میں بھی زندہ رہے۔ علوم طبعی البتہ دو صدیوں کے لئے بالکل مُردہ ہو گئے۔ انیسویں صدی کے وسط میں اسلامی ادب کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہُوا۔ مطابع کی ایجاد و استعمال کے ساتھ ترکی، شام اور مصر میں تاریخ ادب کے اہم اور جدید باب کا آغاز ہُوا۔ مصر اور شام میں ادب کی تمام اصناف جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے یعنی فقہ اور تصوّف سے لے کر داستان گوئی تک پر بہار آ گئی اور یورپ کے اچھے بُرے سب قسم کے تراجم کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ لیکن دَور جدید کی ان تصنیفات اور تالیفات میں سے سب سے زیادہ اثر اور قبولیت مقبول پیرایہ میں لکھی ہوئی کتب فقہ کے حصّے میں آئی۔ اس سلسلہ میں سعد حلیم پاشا کے مختصر سے شاہکار یعنی ' اسلام شمق '(اسلامی بنانا) کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ یہ کتاب ترکی زبان میں لکھی گئی اور عربی میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ زمانہ حال کی مملکت کو اُصول شرعی پہ چلانا یا اُسے حکومت الٰہیہ کا جامہ پہنانا چاہیئے۔ مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ اُن کی دوبارہ اقبال مندی کا واحد ذریعہ صحیح اسلام کی طرف اُن کا واپس آجانا ہے کیونکہ حقیقی اسلام سے انحراف ہی اُن کے زوال و ادبار کا موجب ہوا ہے۔

ہندوستان میں بھی ہمیں اسلامی ادب کا احیاء فقہ کے مسائل متنازعہ میں ہی نظر آرہا ہے حیدرآباد میں ایک جدید ثقافت کی بنیادیں جو ادب جدید کی ایک نئی زبان یعنی اُردو سے وابستہ ہیں جو عالم اسلام کی چوتھی بڑی زبان سمجھی جائے گی اُس مسلم فرمانروا کے ہاتھوں مضبوط و مستحکم استوار کی جا رہی ہیں جس کی خدمت میرے لئے وجہ افتخار ہے۔ عالم اسلام میں ہر کہیں ایک دَورِ جدید کی ابتدا اور ایک نشاۃ ثانیہ کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ عالم اسلام کی اس حیاتِ نو

کی بدولت اسلام کو وہ سربلندی اور عظمت نصیب ہو کہ وہ دُنیا میں دوبارہ اپنے مقصد کی تکمیل میں کامیاب ہو ۔

خطبۂ پنجم

رواداری

رواداری اعلیٰ درجے کی شائستگی۔ ثقافت و شرافت
کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ مغربی مصنّفین نے مسلمانوں
کی تاریخ اور مذہب اسلام کے خلاف الزامات کا جو
طومار باندھا ہے اُس میں عدم رواداری یا تعصب
سب سے زیادہ ظالمانہ اور سنگین الزام ہے۔
حقیقتِ حال اور اس الزام کی نوعیت پر غور کرتے
ہوئے ہمیں "اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" کی مثل یاد آجاتی

ہے۔ ذرا تاریخ عالم پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ظلم و تعصب کس کا شیوہ رہا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہسپانیہ۔ صقلیہ اور اپولیا میں مسلمانوں کا ایسا قتلِ عام ہوا کہ اُن ممالک میں مسلمانوں کا نام لیوا بھی باقی نہ رہا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ یونان کی ۱۸۲۱ء کی بغاوت میں مسلمانوں کو چُن چُن کر یوں قتل کیا گیا کہ اُن کا نام و نشان مٹ گیا اور اُن کی مسجدوں کی لفظاً و معناً اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں کہ بلقان میں مسلمانوں کی اکثریت کو تمام یورپ کی تائید و حمایت کے ساتھ پوری ہولناکی اور بے دردی سے اقلیت میں بدل دیا گیا۔ اس حقیقت سے کسے یارائے انکار ہے کہ عیسائی رعایا کو مسلمان حاکموں کے خلاف بغاوت اور مسلمانوں کے قتلِ عام پر اُکسایا گیا۔ اور مسلمانوں کی طرف سے اس صورتِ حال کے تدارک کی کوشش کو ظلم و زیادتی سے تعبیر کیا گیا۔ اس تاریخی حقیقت کو کون فراموش کر سکتا ہے کہ یورپ بھر میں

یہودیوں کو قرونِ وسطیٰ میں ہولناک اور لرزہ انگیز مذہبی عقوبات کا سامنا کرنا پڑا۔ کون نہیں جانتا کہ ہسپانیہ سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد یہودیوں پہ کیا بپتا پڑی۔ پرانے قصوں کو چھوڑیئے زار کے روس اور پولینڈ میں زمانہ حال ہی میں جب مدعیانِ تہذیب یہودیوں کی تباہی و بربادی کو کارِ ثواب سمجھ رہے تھے یہودیوں پہ کیا گذری۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو سلطنت اسلامی میں نہ صرف آزادی ضمیر و عقیدہ میسر تھی بلکہ انہیں اپنے قومی امور میں پوری پوری حکومت خود اختیاری بھی حاصل تھی۔

ہسپانیہ میں خلفائے بنی اُمیّہ اور بغداد میں خلفائے عباسیہ کے عہد میں عیسائیوں اور یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ سکولوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہی نہیں کیا جاتا تھا بلکہ سرکاری خرچ پہ بورڈنگوں میں اُن کے قیام و طعام کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ جب ہسپانیہ سے مسلمانوں کا اخراج مکمل ہو گیا تو عیسائی فاتحین نے یہودیوں کو ایک دردناک عقوبت مذہبی میں مبتلا

کہ دیا۔ ان یہودیوں میں سے جو جان بچا کر بھاگ نکلے بعض تو مراکش پہنچے اور سینکڑوں ترکی کی وسیع سلطنت میں پناہ گزیں ہوئے جہاں اُن کی اولاد آج بھی علیحدہ علیحدہ جماعتوں میں زندگی بسر کرتی ہے ان جماعتوں کے افراد آپس میں آج تک ایک قدیم ہسپانوی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ اُس زمانے کا عالم اسلام تعزیر مذہبی سے بھاگنے والوں کے لئے ایک حرم تھا۔ عیسائیوں اور یہودی کی حیثیت اسلامی دُنیا میں مسلمانوں سے بلا شبہ کمتر تھی لیکن یہ حالت اُس زمانے کے یورپ میں مسلمانوں۔ یہودیوں اور کافروں تو درکنار روشن خیال علماً کی حالت سے بھی درجہا بہتر اور لائق ترجیح تھی۔

مغربی عیسائیوں کو اٹھارویں صدی کے 'بحر العلوم' کے مرتب کرنے والوں سے پہلے نہ مسلمانوں کے معتقدات کے متعلق کوئی واقفیت حاصل تھی نہ وہ اس کے خواہاں تھے اور نہ ہی وہ مسلمانوں کے متعلق مشرقی عیسائیوں کے خیالات جاننے کے آرزومند

تھے۔ عیسائی چرچ دو فرقوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور اُن کے درمیان اختلاف و عناد اس درجہ ترقی کر چکا تھا کہ جیسا گبن نے ثابت کیا ہے مشرقی عیسائی مسلمانوں کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرنے کو۔ جہاں انہیں ہر طرح ضمیر و عقیدہ ہی میں نہیں اپنے شعائر مذہبی کی ادائیگی میں بھی آزادی حاصل تھی عیسائیوں کی سلطنت میں رہنے پر ترجیح دیتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اپنے بھائی عیسائیوں کے زیرِ حکومت انہیں یا تو تبدیلی مذہب یعنی رومن کیتھولک بن جانے پر مجبور کیا جائے گا یا پھر انہیں نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ مغربی عیسائی تو مسلمانوں کو کافر اور بُت پرست کہتے تھے۔ اُن کی بہت سی کتابوں میں تو انہیں محمد کے بُت کا پجاری بتایا گیا ہے غرناطہ کی تسخیر کے حالات میں تو اُن ہیبت ناک بتوں کی تفاصیل بھی درج ہیں جو مسلمان پوجا کرتے تھے۔ اس حیرت انگیز نادانی کے مقابلے میں مسلمانوں کو حقیقت عیسائیت اور اسلام اور عیسائیت کے

اختلاف سے پوری پوری واقفیت حاصل تھی۔ اگر اُس زمانے میں یورپ کو اسلام سے متعلق اتنی ہی معلومات حاصل ہوتیں جتنی مسلمانوں کو عالمِ عیسائیت سے متعلق حاصل تھیں تو حروب صلیبیہ جن میں کبھی کبھار شجاعت و شرافت کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے لیکن جو بالعموم جنونِ مذہبی کے طوفان کے سوا کچھ نہ تھیں کبھی شروع نہ ہوتیں کیونکہ وہ جنون کامل نادانی اور غلط فہمی کا نتیجہ تھا سنیئے ایک مشہور فرانسیسی مصنف اس بارے میں کیا کہتا ہے :-

"عالمِ عیسائیت کا ہر شاعر مسلمان کو کافر اور بُت پرست جانتا تھا جس کے تین بُت مہاوند۔ اپولین اور ترموگان تھے۔ کہا گیا تھا کہ جب ہسپانیہ میں عیسائیوں نے مسلمانوں پر فتح پائی اور انہیں سارا غاثہ شہر کے دروازوں تک بھگا دیا تو مسلمان واپس لوٹے اور اُنہوں نے اپنے بُتوں کو پہلے پامال اور پھر روند کر پاش پاش کر دیا۔ ایک عیسائی شاعر کہتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دیوتا اپولین کے بُت کو جو

ایک کال کوٹھڑی میں چھپا رکھا تھا بڑی طرح زدوکوب لیا۔ اُسے مغلظات سُنائیں اُس کی مشکیں کسیں اُسے پھانسی پر لٹکایا اور لاٹھیوں کی ضربوں سے اُسے پاش پاش کر کے اُس کے ٹکڑوں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ انہوں نے اپنے دوسرے بُت مہاوند کو ایک گڑھے میں پھینک دیا اور کتوں اور سُوروں سے اُس کی بوٹیاں نچوائیں۔ دیوتاؤں کی ایسی بے حُرمتی شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔ بعد میں مسلمانوں نے اپنے ان ناروا اعمال سے توبہ کی اور اپنے دیوتاؤں کو دوبارہ عام عبادت کے لئے بحال کر دیا اور جب بادشاہ چارلس سارا غاسۃ کے شہر میں داخل ہوا تو اُس نے اُن کے بُت محمد کو دوسرے تمام بتوں کے ساتھ ہتھوڑوں سے پاش پاش کرا دیا"

مسلمانوں کی یہ "تاریخ" تھی جو مغربی عیسائیوں کے لئے تصنیف کی جاتی تھی۔ یہ خیالات تھے جو حروب صلیبیہ کے لشکریوں کو اُس زمانے کی مہذب ترین قوم کے خلاف بر انگیختہ کیا کرتے تھے۔ عالمِ عیسائیت تمام

بیرونی دُنیا کو دائمی جہنمی سمجھتی تھی اسلام کی تعلیم
نہ تھی۔ عالم عیسائیت میں بلا شبہ کچھ نیک اور
دل لوگ ایسے بھی تھے جنہیں یہ غم کھائے جاتا
کہ بعض لوگ دائمی ملعون ہو جائیں اور جوان ملاعنہ
عیسائی بنا کر بچا لینا چاہتے تھے کہ اُن نیک
لوگوں کی نظر میں کوئی دوسری صورت ملاعنہ
نجات و رستگاری کی نہ تھی۔ اسائی کے سینٹ فرانس
کے وفد کا مسلمانوں کے پاس جانا اور اُس وفد کی
پذیرائی دونوں نظریات کی تفاوت ظاہر کرتا ہے
اسی طرح مصر کے خلاف سینٹ لوئی کا جہاد
ذہنیت کو عیاں کرتا ہے کیونکہ اُس کا مقصد
مسلمانوں پر فتنہ ارتداد کا مسلّط کرنا تھا۔ اس
نظریہ کی ایک نہایت ہی دلچسپ مثال حلقہ احباب
یعنی رکویکرز، کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ نومبر ۱۹۰۷ء
میں اخبار مانچسٹر گارڈین میں بریلسفورڈ نے
پر ایک مقالہ لکھا تھا:

چارلس دوم کے زمانے میں ایک نوجوان انگریز

اتون جو خادمہ رہ چکی تھی "حلقۂ احباب" کی رکن بن
ی اور اس وجہ سے موردِ عتاب و عذاب بنی۔
و مرتبہ تو اُسے چرچ کے مروّجہ آداب و رسوم
کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر کوڑے
لگائے گئے۔ وہ دو مرد کویکروں کے ساتھ امریکہ میں
تبلیغ و تلقین کے لئے پہنچی تو اُن تینوں کو جادوگری
کے الزام میں جیل میں ٹھونس دیا گیا جہاں بے انتہا
سختیاں جھیلنے پر انہیں ایک مدّت کے بعد رہائی نصیب
ہوئی۔ انگلستان میں واپسی کے بعد اُس نوجوان لڑکی
کے دل میں ولولہ تبلیغ جو اُٹھا تو اُس نے تہیّہ کر لیا
کہ سلطان ٹرکی کو عیسائیت کی تبلیغ کرنی چاہیئے۔ وہ
پانچ مرد ساتھیوں کی معیت میں مقصد تبلیغ کی تکمیل کے
لئے روانہ ہوئی اُس کے پانچ مرد ساتھی تو احتساب
مذہبی کی زد میں آگئے اور دُنیا کو اُن کے متعلق اتنا
ہی معلوم ہے کہ اُن میں سے صرف ایک شخص اس
شان سے زندہ سلامت انگلستان پہنچا کہ ہذیاں سرائی
اور جنون اُس پر مسلّط تھا۔ خود اس خاتون نے تعزیہ

مذہبی اور ایذا رسانی اور ہر قسم کی پریشانی سے قدم قدم پہ دو چار ہونے کے باوجود اپنے عزم راسخ میں کوئی لغزش پیدا نہ ہونے دی اور تن تنہا سفر جاری رکھا۔ وہ وینس سے جہاز میں سوار ہوئی اور جہاز راں نے اُسے اپنی منزلِ مقصود سے بہت دُور مگر اسلامی سلطنت کی حدود میں بمقام موریہ اُتار دیا۔ موریہ سے وہ پیدل ایڈریا نوپل پہنچی۔ لیکن اُس نے یہ زحمت ناحق برداشت کی۔ اسلامی سلطنت میں قدم رکھتے ہی تعزبر مذہبی کا خاتمہ تھا۔ ہر شخص اُس سے مروّت سے پیش آیا اور سرکاری ملازمین نے ہر طرح اُس کی امداد کی جب وہ ایڈریا نوپل پہنچی جہاں اُس وقت سلطان بایزید مقیم تھے تو اُس نے شرفِ باریابی کی خواہش یہ کہتے ہوئے ظاہر کی کہ وہ سلطان کے نام خود احکم الحاکمین کا پیغام لائی ہے۔ سلطان المعظم نے آداب شاہی کے مطابق اُس کا استقبال کیا اور اُسے ایک معزّز سفیر کے تمام امتیازات سے مشرّف فرمایا سلطان اور اُن کے درباریوں نے اس نوجوان مبلغہ کا

پیغام پورے احترام سے سُنا۔ اور جب وہ اپنا پیغام سُنا چکی تو سب نے بیک زبان کہا کہ ہمارا تو اُن باتوں پر پہلے ہی ایمان ہے۔ سلطان المعظم نے اس خاتون کو اپنے ملک میں قیام کی دعوت دی اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر ہماری دعوت کو قبول کرنے میں عذر ہو تو واپسی کے لئے اس قدر بدرقہ ضرور قبول کیا جائے جو اُس شہنشاہ کے ایلچی کے شایانِ شان ہو جس کا سفیر بن کر آپ تشریف لائی ہیں۔ لیکن اس خاتون نے سلطان کی دونوں پیشکش منظور نہ کیں اور جیسی آئی تھی ویسی ہی تن تنہا اور پا پیادہ چل کھڑی ہوئی اور راستے میں مزاحمت و اذیّت تو کجا ایک خراش تک کے بغیر قسطنطنیہ پہنچی جہاں سے انگلستان جانے والے ایک جہاز پر سوار ہو گئی۔ یہ کس قدر حیرت انگیز تضاد ہے کہ اہلِ یورپ کو اپنے مذہبی قوانین سے انحراف پر رواداری کی دولت نصیب ہوئی اور مسلمانوں نے جب مذہب سے بے اعتنائی برتی تو اُن میں عدم رواداری کے آثار پیدا اور ایک شان دار تہذیب کے

زوال کی علامات نمودار ہوئیں۔ میں نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے عمل کی تفاوت کی بنا اخلاق و اطوار نہیں مذہب ہے۔ بلاشبہ پہلے زمانہ میں بھی خال خال مہذب اور نیک لوگوں میں رواداری کی خوبی موجود تھی لیکن وہ لوگ مروجہ مذہب سے منحرف ہوتے تھے۔ رواداری کو مذہب کا فقدان نہیں تو عدم مذہب ضرور سمجھا جاتا تھا۔ ظہور اسلام سے پہلے بنی نوع انسان کے روبرو رواداری کی مذہب کے لئے جزو لازمی کی حیثیت سے کبھی تلقین نہ ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے لئے یہودیت، عیسائیت اور اسلام ایک ہی مذہب کی تین صورتیں ہیں اور یہ مذہب اپنی حقیقی صورت میں دین ابراہیم یا الاسلام یعنی خدا کی مرضی پر گردن ڈال دینا ہے یہی حکومت الٰہیہ کی بنیاد ہے۔

یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد خدا کی بخشش کو اپنی ہی منتخب قوم کے لئے مخصوص کر لیا اور خدا کی بادشاہت کو اپنی ہی نسل کا ترکہ سمجھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بہت سے ارشادات سے

مثلاً جب اُن سے دریافت کیا گیا کہ بچوں سے روٹی
چھین کر کتوں کے آگے ڈال دینا مناسب ہے یا
جب اُنھوں نے فرمایا کہ وہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی
بھیڑوں کے لئے بھیجے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا
مشن صرف عبرانیوں کے لئے تھا۔ سینٹ پیٹر کے ایک
خاص رویا کے بعد عیسائیوں نے اپنے آپ کو امراً میں
انجیل مقدس کی تبلیغ کا مجاز سمجھا۔

عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کی رافت و رحمت کو اُن
لوگوں تک ہی محدود سمجھا جو خاص معتقدات پر ایمان
رکھتے تھے اُنھوں نے اُس زمین پر خدا کی بادشاہت کو
بھی صرف راسخ العقیدہ عیسائیوں ہی کے لئے مخصوص سمجھا۔
ہر وہ شخص جو عیسائیت کے معتقدات پر ایمان نہ رکھتا
تھا ایک شودر سمجھا جاتا تھا یا پھر ایسا مجرم جس کو اپنی
روح کی تسکین و آسائش کے لئے اپنے آپ کو بڑی
بڑی جسمانی سزاؤں اور اذیتوں میں مبتلا رکھنا چاہیئے۔ خدا
کی حقیقی بادشاہت کی تصویر تو صرف آئینہ اسلام ہی میں
نظر آسکتی ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج وَلَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

ترجمہ - یہ تحقیق بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاریٰ اور فرقۂ صابئین جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ پر اور روز قیامت پر اور کارگذاری اچھی کرے ایسوں کے لئے اُن کا حق الخدمت ہی ہے اُن کے پروردگار کے پاس اور کسی قسم کا اندیشہ بھی نہیں اُن پر اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْنَصٰرٰى ط تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ بَلٰى ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ص وَلَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

ترجمہ - اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہیں جانے پاوے گا بجز اُن لوگوں کے جو یہودی ہوں یا اُن لوگوں کے جو نصرانی ہوں - یہ دل بہلانے کی باتیں ہیں

آپ کہیئے کہ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ضرور دوسرے
لوگ جاویں گے۔ جو کوئی شخص بھی اپنا رُخ اللہ کی طرف جھکا
دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اُس کا عوض
پروردگار کے پاس پہنچ کر ہے اور نہ ایسے لوگوں پہ کوئی
اندیشہ ہے اور نہ ایسے لوگ مغموم ہونے والے ہیں۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوا ط قُلْ بَلْ
مِلَّةَ اِبْرٰهِمَ حَنِيْفًا ط وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝
قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى
اِبْرٰهِمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ
وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ
رَّبِّهِمْ ج لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ز وَنَحْنُ لَهٗ
مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ
فَقَدِ اهْتَدَوْا ج وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ
شِقَاقٍ ع فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ع وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

ترجمہ۔ اور کہا انہوں نے ہو جاؤ موسائی، عیسائی راہ
پاؤ گے تم۔ کہہ بلکہ پیروی کرتے ہیں ہم دین ابراہیم کی
جو ایک طرف کا تھا اور نہ تھا مشرکوں سے۔ کہو ایمان

لائے ہم ساتھ اللہ کے اور جو کچھ اُتاری گئی طرف ہماری اور جو کچھ اُتاری گئی طرف ابراہیم کی اور اسمٰعیل اور یعقوب اور اولاد اُس کی اور جو کچھ دی گئی موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو کچھ دی گئی پیغمبروں کو پروردگار اپنے سے۔ نہیں جُدائی ڈالتے ہم درمیان کسی کے ان میں سے اور ہم واسطے اُس کے مطیع ہیں پس اگر ایمان لاویں ساتھ اُس چیز کے کہ ایمان لائے ہو تم ساتھ اُس کے پس تحقیق راہ پائی اور اگر پھر جاویں پس سوائے اُس کے نہیں کہ وہ بیچ خلاف کے ہیں پس شتاب کفایت کرے گا تجھ کو اُن سے اللہ اور وہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ج لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ط لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ج وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ج وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ج

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝ لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ج قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ج فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ج لَا انْفِصَامَ لَهَا ط وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ ۔ البتہ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں ۔ وہ ہمیشہ زندہ خود قائم رکھنے والا ہے اس پر نہ اونگھ غالب آتی ہے اور نہ نیند ، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے وہ کون ہے جو اس کے پاس سوائے اس کی اجازت کے سفارش کرے ۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے میں ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پہ احاطہ نہیں کر سکتے ۔سوائے اس کے جو وہ چاہے اس کا علم آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے اور ان دونوں کی حفاظت اس کو تھکاتی نہیں اور وہ بہت عظمت والا ہے ۔ دین میں کوئی زبردستی (منوانا) نہیں ، ہدایت (کی راہ) گمراہی سے واضح ہو چکی ہے ۔ بس جو شخص شیطان کا انکار کرتا ہے اور اللہ پہ ایمان لاتا ہے

اس نے ایک محکم جائے گرفت کو مضبوط پکڑ لیا جو
ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سُننے والا جاننے والا ہے ۔

یہ دونوں آیات ایک دوسری کے معنوں کی تکمیل کرتی ہیں جہاں اللہ کی جبروت و احکم الحاکمین کا یہ تصور موجود ہو وہاں مذہب میں کوئی جبر یا اکراہ ہو نہیں سکتا ۔

انسان اطاعت و انحراف کا راستہ خود اختیار کرتا ہے اُن لوگوں کے لئے جو نافرمانی کرتے ہیں بجائے خود یہ کافی سزا ہے کہ وہ راستی اور حقیقت کے نور سے دُور تر ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ مسلمان بالعموم اس امر کو نظر انداز کر جاتا ہے کہ اس قانون کا اطلاق دوسروں کی طرح خود مسلمان پر بھی ہوتا ہے قوانین الٰہی سب پر مُسلّط ہیں اُن کی عالمگیری سے کسے مفر ہے مسلمانوں میں دوسرے لوگوں کے عقائد و آراء سے عدم رواداری اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ مسلمانوں کے دل و دماغ سے قرآن کریم نے خداوند تعالیٰ کی شانِ رحیمی اور جبروت کا جو نقشہ

پیش کیا ہے محو ہو چکا ہے۔

غیر مسلم دُنیا یہ اعتراض کرے گی کہ مسلمانوں میں رواداری مفقود ہو چکی ہے اور وہ ہر اُس شخص کو جو اُن کا ہمنوا نہ ہو کافر کہتے ہیں۔ قلق تو اس بات کا ہے بہت سے مسلمان اس قسم کی زیادتی کا جواز قرآنِ کریم سے یہ لاتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں کافروں کا ذکر موجود ہے اور کافروں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اُن سے مسلمانوں کو کوئی سروکار نہ ہونا چاہیئے اور اُن سے مسلمانوں کو برسرِ پیکار رہنا چاہیئے۔ آپ حضرات کو ایک صبر آزما تفصیل میں مبتلا کر دینے کے احتمال کے باوجود میں اجازت چاہوں گا کہ اصطلاح "کافر" کا مفہوم بیان کردوں۔

کافر، مُشرک اور اہلِ کتاب

قرآنِ کریم میں اس لفظ کے دو مفہوم ہیں لیکن جونہی منشا الٰہی پا لیا جائے ایک ہی مفہوم رہ جاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کافر کسی مذہب کا پیرو نہیں۔

کافر تو بنی نوع انسان کے لئے خدا کے رحیمانہ منشاد مقصد ہی کا مخالف اور تمام مذاہب کی صداقتوں کا منکر ہے۔ وہ تمام کتب سماوی کا انکار کرتا ہے وہ اُن تمام نبیوں کو جھٹلاتا ہے جنہیں مسلمان حکمِ الٰہی کی متابعت میں بلا تفریق و امتیاز خدا کے پیغمبر مانتا ہے۔ سب سے پہلا کافر ابلیس ایک فرشتہ تھا جس نے اپنے غرور و نخوت کی بنا پر انسان کا احترام نہ کرنے میں حکمِ الٰہی سے سرتابی کی۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ٥

ترجمہ۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو تو انہوں نے فرماں برداری کی مگر ابلیس (نے نہ کی) اس نے انکار کیا اور تکبّر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

قرآنِ کریم نے بار بار یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ اُس نے تمام ادیان کی صداقتوں کی تصدیق کی ہے

پہلی کتابیں معدوم ہو چکی تھیں یا محرف۔ پہلے نبیوں کی زندگی اور تعلیم ایک افسانہ بن کر رہ گئی تھی۔ نبیوں کے متعلق ایسی ایسی کہانیاں اور روایات تراشی گئی تھیں کہ خود اُن کے وجود سے تاریخ کو ایک گونہ انکار ہونے لگا۔ قرآنِ کریم فرماتا ہے "یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ نبی کریم کو دیکھ لو وہ تو تم لوگوں میں ہی زندگی بسر کرتے ہیں اور تم ہی میں تلقین فرماتے ہیں" اگر قرآنِ کریم کا وجود نہ ہوتا اور اگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز نہ ہوتے تو آن لوگوں پر جو نبیوں کو اللہ کی طرف سے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے مامور کئے جانے کو ایک خوش فہمی اور زود اعتقادی سمجھتے ہیں گرفت کرنا مشکل تھا۔ پہلی الہامی کتابوں کی سچائیوں پر آج قرآن اور محمدؐ ہی کی مُہرِ تصدیق ثبت ہے۔ جو لوگ ایک نبی اور ایک الہام کے قائل نہیں حقیقت میں وہ بنی نوع انسان کے ہدایت الٰہی کے وجود سے جو تمام الہامی

مذاہب کی ایک بنیادی حقیقت سے منکر ہیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ۔ کہہ جو کوئی جبریل کا دشمن (ہو) اس نے تو اللہ کے حکم سے اس کو تیرے دل پہ اُتارا اس کی تصدیق کرتا ہوا جو اس سے پہلے ہے اور مومنوں کے لئے ہدایت اور خوش خبری (ہے) جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اُس کے رسولوں اور جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ (ان) کافروں کا دشمن ہے۔

قرآنِ کریم کی اُن آیات میں جن میں جنگ کا تذکرہ ہے کافر سے مراد ایسے دشمن ہیں جو فرزندانِ اسلام سے برسرپیکار ہیں۔ "کافر" کا اطلاق نہ ہر بُت پرست اور نہ ہی غیر مسلم پہ ہے جیسا کہ اس

اعلان امان سے ظاہر ہے جو اُن بد عہد قبائل سے متعلق ہے جنہوں نے مسلمانوں سے معاہدات کرنے کے بعد انہیں مسلسل توڑا اور مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ؕ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

ترجمہ۔ بیزاری ہے خدا کی طرف سے اور رسول
اُس کے کی طرف سے اُن لوگوں کی کہ عہد باندھا
تم نے مشرکوں سے۔ پس پھرو بیچ زمین کے چار مہینے
اور جانو یہ کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ کو اور
تحقیق اللہ رسوا کرنے والا ہے کافروں کو۔ اور پکارنا ہے
اللہ کی طرف سے اور رسول اُس کے کی طرف سے طرف
لوگوں کی دن حج بڑے کے یہ کہ اللہ بیزار ہے مشرکوں
سے اور رسول اُس کا بھی۔ پس اگر توبہ کرو تم پس
وہ بہتر ہے واسطے تمہارے اور اگر پھر جاؤ تم پس
جانو یہ کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ کو اور
خوش خبری دے ان لوگوں کو کہ کافر ہیں ساتھ عذاب
درد دینے والے کے۔ مگر وہ لوگ کہ عہد باندھا تھا
تم نے مشرکوں میں سے پھر نہ کم کیا اُنہوں نے تم
سے کچھ اور نہ مدد کی اُوپر تمہارے کسی کو۔ پس پورا
کرو طرف اُن کی عہد اُن کا مدّت اُن کی تک تحقیق
اللہ دوست رکھتا ہے پرہیزگاروں کو۔

مشرکین اور کافرین میں صاف صاف تفریق کی گئی

ہے مشرکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ
کسی دوسرے کو شریک ٹھیرائیں وہ بُت پرست جنہوں
نے مسلمانوں سے اپنے وعدوں اور معاہدوں کو پورا
کیا کافرین میں سے نہ تھے پیغمبر خدا نے خود ارشاد
فرمایا کہ جو شخص مسلمان کو سلام کہے اُسے کافر
مت کہو۔ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں جان بوجھ کر
اور بالارادہ بُرائی کرنے والے لوگ ہی کافر ہیں
خواہ اُن کا تعلق کسی نسل، عقیدہ اور قوم سے
ہی کیوں نہ ہو۔

اس طویل جملہ معترضہ کے لئے معذرت خواہ ہوں۔
میں نے اس تفصیل کو اس لئے ضروری سمجھا کہ
قرآنِ حکیم اور سیرت نبوی سے کما حقہٗ واقفیت
نہ ہونے کی بنا پر خود مسلمانوں پہ اس مسئلہ میں
ایک پراگندہ خیالی مسلّط ہے۔

بہت سے مسلمان اس امر کو یک قلم فراموش
کر دیتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کے حلیفوں میں عرب
میں اسلام کا ڈنکہ بج چکنے کے بعد بھی بہت سے

بُت پرست تھے اور آنحضرت نے اُن لوگوں سے اپنے معاہدات کو لفظاً اور معناً پورا کیا۔ اپنے معاہدات کی میعاد ختم ہونے سے پہلے بُت پرستوں کا مشرف بہ اسلام ہونا مسلمانوں کی شمشیر آبدار کا مرہونِ منت نہ تھا بلکہ اُن کے تقویٰ اور حسنِ عمل کا ثمر تھا۔ عرب کے بُت پرستوں کی تسخیر اور اُن کے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کی داستان نہایت سادہ ہے۔

ان بُت پرستوں کے پاس تعلیم اسلامی کے مقابلہ میں پیش کرنے کے لئے توہمات کے سوا تو کچھ تھا نہیں۔ وہ جنگ میں فتح کے لئے اپنے مقامی دیوتاؤں سے تائید و نصرت کے طالب ہوتے تھے اور اپنی قوت بازو پر اُن کو نہایت غرور تھا۔ شروع شروع میں تو اُن کا پلّہ اس لحاظ سے ضرور بھاری رہا۔ لیکن جب مسلمانوں کو اس پر بھی اُن پر فتح نصیب ہوئی تو وہ بے حد مایوس ہوئے اور اُن کے دیوتاؤں کی طاقت و فوقیت کے تمام افسانے ہمیشہ کے لئے مٹّی میں رل گئے تو اُن کی ہدایت یابی لازمی تھی۔ اپنے

اپنے وقت پر اُن میں بڑے سے بڑا سرکش دولتِ اسلام سے مالا مال ہوتا گیا۔

اہلِ کتاب سے جن سے مراد ایسے لوگ تھے جن تک پہلے کسی نبی کا الہام پہنچ چکا تھا مثلاً یہودی، عیسائی اور زردشتی مسلمانوں کو فوراً دو چار ہونا پڑا۔ ان سب کی طرف آنحضرت صلعم کا رویہ لطف و کرم کا تھا۔ حضور نے سینا کے عیسائی راہبوں کو جس منشور خسروی سے سرفراز فرمایا۔ وہ آج بھی موجود ہے اُس منشور نبویؐ کے لفظ لفظ سے نیک اندیشی اور خیر خواہی ہی نہیں بلکہ اُلفت و محبّت رافت و رحمت ٹپکتی ہے۔ آنحضرت صلعم نے مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ جب تک وہ وفادار رہے مسلمانوں ہی کا سا سلوک کیا۔ رسولِ خدا نے کسی شخص یا جماعت پر کبھی کوئی جبر نہیں کیا اور نہ ہی اختلاف عقائد کی بنا پر کسی فرد کو اذیت پہنچائی۔ نہ کسی جماعت پر حملہ کیا۔ افراد و اقوام کے ساتھ سلوک کی بنا ہمیشہ اُن کے اعمال ہی رہے۔ حضور نبی کریمؐ نے عیسائی اور

زردشتی وفود کا جس طرح استقبال و احترام فرمایا اُس کی تفصیل آج بھی تاریخ کے اوراق کو مزین کر رہی ہے۔ ان باتوں میں تعصب یا مذہبی عدم رواداری کا شائبہ تک نہ تھا۔

مسلمانوں کو یہ حقیقت جسے وہ اکثر فراموش کر دیتے ہیں، ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے ہمارے نظریہ کے لئے یہ امر بھی نہایت اہم ہے کہ آنحضرت صلعم نے اہل کتاب کو اپنا پیرو ہو جانے کی کبھی دعوت نہ دی بلکہ اُن سے صرف یہ ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ کی بادشاہت کو مان لیں۔ خدا اور بندوں کے درمیان مذہبی رہنماؤں کی جو جماعت پیدا ہو گئی ہے اُسے توڑ دیں۔ اپنے مذاہب کی خالص تعلیم کو از سر نو زندہ اور تسلیم کریں۔ اصل میں آنحضرت صلعم ہر شخص سے دریافت فرماتے تھے "کیا تم خدا کی اُس بادشاہت کے طلبگار ہو جس میں تمام بنی نوع انسان شامل ہیں، یا تم تمام بنی نوع انسان سے کٹ کر صرف اپنی ہی قوم کے حامی ہو" بلاشبہ پہلا عقیدہ امن و امان اور انسانی ترقی کا طریقہ ہے

اور دوسرا جنگ و جدل ظلم و عدوان اور معصیت کا راستہ ہے۔ دُنیا کے اُن فرماں رواؤں نے جن کے پاس حضور رسالت مآب کا پیغام مبارک پہنچا اُسے ایک مذہبی مجنون اور ایک گستاخ و مغرور نو دولتے کا پیغام سمجھا (نعوذ باللہ) آنحضرتؐ کے سفراء کی طرح طرح سے بے آبروئی کی گئی، اُنہیں اذیتیں پہنچائی گئیں اور انتہا یہ ہے کہ اُن میں سے بعض کو سفارت کی انجام دہی میں مرتبہ شہادت بھی نصیب ہُوا۔ اُن فرمانرواؤں کی شقاوت و بدبختی اور پیغام نبویؐ کی صداقت پر غور تو فرمائیے اگر آج تاجدارانِ عالم کے پاس جب تمام اہلِ بصیرت پیغمبرؐ اسلام کے مقدمات کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے ہیں۔ جب دنیا نے بڑی حد تک مذہبی رہنماؤں یعنی پادریوں اور پروہتوں کے چنگل سے نجات پالی ہے اور آج جب کہ اخوّت انسانی کی حقیقت اور اہمیت کا احساس وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے ایک ویسا ہی وفد پہنچے تو اس کا استقبال کس قدر مختلف ہو گا۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ - کہہ اے اہلِ کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے اور اگر وہ پھر جائیں تو تم کہو گواہ رہو کہ ہم فرماں بردار ہیں -

اگر وہ اہلِ کتاب جن سے اس طرح اپیل کی گئی تھی اس تجویز کو تسلیم کر لیتے تو ان کا شمار بھی مسلموں میں ہی سے ہوتا - پیغمبر خدا کا مقصد اپنے لئے کوئی جاہ و حشم مال و دولت یا قوت و سلطنت حاصل کرنا نہ تھا حضورؐ کا منشاء واحد تو اقوامِ عالم تک اپنا پیغام رحمت پہنچانا تھا - موحد عیسائی اور ایسے یہودی قبیلے جو اپنے ربیوں

کے توہمات سے آزاد اور اپنے کاہنوں کی گرفت سے نجات پا لیتے آنحضرت صلعم کی نظر میں مسلمانوں ہی کی سی جماعت سمجھے جاتے۔ اگرچہ عیسائیوں، یہودیوں اور زردشتیوں نے حضورؐ کے پیغام کی قدر نہ کی اور اُن کے بادشاہوں نے سفرائے اسلام کے ساتھ توہین آمیز اور ظالمانہ سلوک روا رکھا اس پر بھی رسولِ خدا کی شانِ رحمت نے اُن قوموں کی طرف اپنا رویہ ہمیشہ مخلصانہ اور مربیانہ رکھا سینا کے راہبوں کے لئے جو منشورِ خسروی جاری ہوا اس پر شاہد ہے۔ بلا شبہ بعد کے مسلمانوں نے آنحضرت کے معیارِ روا داری پر قائم نہ رہتے ہوئے بلکہ بعض اوقات اُس سے منحرف ہو کر دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے متکبّرانہ سلوک روا رکھا ہے لیکن اس پر بھی اُنہوں نے بحیثیت مجموعی یہودیوں اور عیسائیوں سے حُسنِ سلوک ہی برتا ہے اور سچ تو یہ ہے ان لوگوں سے حُسنِ سلوک خود شریعت اسلامیہ کا مطالبہ ہے۔

تاریخی شہادت

مصر میں مسلمانوں کی فتوحات کے زمانہ میں قبطیوں اور مسلمانوں کے تعلقات میں جو دوستی، باہمی مروت اور شگفتگی پائی جاتی تھی آج صدیاں گذر جانے پر بھی اُسی شان سے برقرار ہے۔ شامی عیسائیوں اور مسلمانوں کے جو باہمی دوستانہ تعلقات ابتدا میں پیدا ہوئے آج بھی اُسی دلآویزی کے ساتھ استوار ہیں شامی عیسائیوں نے تو علی الاعلان ہمیشہ غیروں کی حکومت پر اپنے لئے مسلمانوں کے تسلّط کو ترجیح دی ہے یہودیوں کی چھوٹی چھوٹی مرفہ الحال بستیاں ہسپانیہ، شمالی افریقہ، شام، عراق اور بعد میں ترکی میں بھی غرض تمام دنیائے اسلام میں موجود تھیں جب عیسائی دنیا میں یہودیوں کے لئے موت و بربادی کا بازار گرم تھا عالم اسلام کی آغوش عاطفت ہی اُن کے لئے واحد پناہ تھی۔ ایک معزز ربّی کی تقلید میں جسے وہ مسیح موعود سمجھتے تھے یہودی برضا و رغبت

جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ لیکن اُن کی ایک بڑی تعداد اپنے آبائی مذہب پر قائم رہی، مسلمانوں نے اُن کو امان دی اور وہ اُس ظلم و جبر کو بالکل بھول گئے جس نے عیسائی دُنیا کو اُن کے لئے ایک مقتل اور جہنّم بنا رکھا تھا۔ ترکی میں جو یہودی آباد ہیں مسلمانوں کو اُن سے کچھ شکایت نہیں، کس قدر تعجب اور حیرت کا مقام ہے کہ فلسطین کے عربی بولنے والے یہودی جو ہسپانیہ اور پولینڈ سے بھاگ کر آئے ہوئے، یہودیوں کی اولاد سے ہیں فلسطین کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے ساتھ فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کی تحریک کے مخالف ہیں۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات کی تشریح کے سلئے میں حضرت عمر ابن الخطاب خلیفہ ثانیؓ کے یروشلم میں فاتحانہ درود کی داستان جو بارہا بیان کی جاتی ہے ضرور دہراؤں گا کیونکہ اس سے اہلِ کتاب کے ساتھ مسلمانوں کے رویّہ کی وضاحت ہوتی ہے۔

مسلمان سپہ سالار فاتح یروشلم نے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں درخواست کی کہ وہ تشریف لاکر بہ نفسِ نفیس مقدس شہر کی کنجیاں وصول فرمادیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ سے اس شانِ سادگی سے روانہ ہوئے کہ خلیفہ کے جاہ وحشم کا علمبردار صرف ایک اونٹ اور ایک غلام تھا۔ آقا اور غلام باری باری اونٹ پر سوار ہوتے اور اس کی نکیل تھامے پیدل چلتے تھے۔ روما کے غلام منصب داروں نے جن کی آنکھوں میں شاہانہ شان و شوکت اور طمطراق کی ایک دنیا ابھی موجود تھی جب عالم اسلام کے اس فقیر شہنشاہ کے اس درجہ سادہ وُرود کو دیکھا تو فرطِ حیرت سے مبہوت سے رہ گئے۔ عیسائی خلیفہ اسلام کو اپنے شہر کے فخر روزگار اور شہرۂ آفاق گرجا میں لے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابھی گرجا ہی میں تشریف فرما تھے کہ نماز عصر کا وقت ہو گیا۔ عیسائی منصب داروں نے اصرار کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گرجا ہی میں مصلیٰ بچھائیں اور نماز ادا فرمادیں لیکن حضرت عمرؓ نے یہ

فرماتے ہوئے گرجا میں نماز ادا فرمانے سے انکار کر دیا
کہ ایسا کرنے میں اس امر کا احتمال ہو سکتا ہے کہ
ناداں مسلمان کسی وقت اس گرجا کو صرف اسی بنا پر
مسجد میں منتقل کرنے پر اصرار کریں کہ یہاں خود خلیفہ
اسلام نے نماز ادا کی تھی ۔ حضرت عمرؓ نے اپنا مصلّیٰ
گرجا کے باہر سیڑھیوں پر اُس مقام پر بچھایا جہاں آج
مسجد عمر موجود ہے۔ سیاح قبہ الصخرہ کو مسجد عمر
کہتے ہیں ۔ وہ مسجد عمر نہیں بلکہ وہ تو مسجد اقصیٰ کے
احاطہ کے اندر یروشلم کا ہیکل ہے جو اسلام کا دوسرا
مقدس شہر ہے۔ اُس دن سے آج تک یہ گرجا عیسائیوں
کی عبادت گاہ ہے مسلمانوں نے اس گرجا کے استعمال
پر اس قدر پابندی ضرور عائد کر دی ہے کہ عیسائیوں
کے ہر فرقے کے لئے اُس کے دروازے کھلے ہیں
اور کسی ایک فرقہ کو دوسروں کے لئے ممانعت اور
اپنے لئے عبادت کا مخصوص حق حاصل نہیں۔

بیت اللحم میں بڑے گرجے اور دوسری مقدس
عبادت گاہوں میں بھی ایسا ہی انتظام و التزام ہے۔

اہلِ کتاب کے ساتھ خلیفہ ہارون الرشید اور بنی اُمیّہ کے زمانہ تک جب مسلمان ہسپانیہ میں فرمانروا تھے یہ سلوک بجا طور پر قائم رہا۔ اُس زمانہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے لئے کسی ایک جگہ کو مشترک عبادت گاہ کے طور پر استعمال کرنے کا رواج عام تھا۔ شام میں اب بھی درجنوں عمارتیں ایسی گنا سکتا ہوں جن کے متعلق اب تک مشہور ہے کہ وہ مشترک عبادتگاہیں استعمال ہوتی تھیں اور میں نے شارون کے میدان میں لُد کے مقام پر سینٹ جارج کا ایک ایسا گرجا دیکھا ہے جس کی چھت ایک مسجد کے ساتھ مشترک ہے اور جن کے درمیان صرف ایک دیوار قائم ہے۔ بلاشبہ ایسا بھی ہُوا ہے کہیں کہیں نادان مسلمانوں نے محض اس بنا پر کہ پہلے وہاں کبھی مسلمانوں نے نماز پڑھی ہے تمام گرجا ہی کو زیر تصرف لانا چاہا ہے۔ لیکن بالعموم مسلمانوں کے سایۂ عاطفت میں عیسائیوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی اُن کے گرجا سلامت تھے۔ وہ نئے گرجا تعمیر کرا سکتے تھے البتہ ایک جدید

حکم کے ماتحت گرجاؤں کے گھنٹے اُتروا دیئے گئے تھے
کیونکہ کہا جاتا ہے اُن کے بے پناہ شور سے مسلمانوں
کو اذیت ہوتی تھی۔ صرف یروشلم کے مقدس گرجا کا
گھنٹہ لگا رہنے دیا گیا۔ عیسائیوں کو عبادت کے لیے
ایک ایسا ہی ناقوس بجانے کی اجازت تھی جیسا حضرت
نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی میں بلانے کے لئے
استعمال کیا تھا۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان عہد
اوّل کی منافرات کو مسلمانوں کے غرور و تکبر سے صدمہ
ضرور پہنچا لیکن ایسا صرف صلیبیوں کے بعد ہی ہوا۔
مسلمانوں نے عیسائیوں پر کبھی کوئی جبر نہیں کیا بلکہ
اُن سے نہایت مربیانہ اور شریفانہ سلوک روا رکھا ہے
تاریخ اسلام کے ایک نہایت مختصر زمانہ میں مسلمانوں
نے اس سے انحراف ضرور کیا۔ مصر کے بنی فاطمہ نے
جب شام کو تھوڑے عرصہ کے لئے اپنے زیر نگیں
کر لیا تو اُس مجنون خلیفہ حاکم بامر اللہ نے جس کی
دروز آج بھی خدا کا اوتار سمجھ کر پرستش کرتے ہیں اُن
پر ظلم و زیادتی کا دروازہ کھول دیا۔ سینکڑوں عیسائی

راہبوں کا جو جوڈیا کی چٹانوں اور غاروں میں رہتے تھے مُثلہ کیا گیا۔ اگرچہ مقامی مسلمانوں کی سفارش پر بہت سے بچ گئے تاہم عیسائی مسلمانوں کی ایذا رسانی کا تختۂ مشق ضرور بنے۔ اُن کے یاتریوں سے مزاحمت کی گئی اور گرجا میں تھوڑی مدت کے لئے پرستش میں خلل ضرور واقع ہوا۔

یورپین یاتریوں نے اس تخریبِ مذہبی کی داستانوں کو نمک مرچ لگا لگا کر اور مزے لے لے کر پھیلایا اور وہ پہلی جنگ صلیبی کا باعث بن گئیں۔ جس وقت صلیبی افواج شام تک پہنچیں بنو فاطمہ کا شام سے اخراج عمل میں آ چکا تھا اور عیسائیوں کو پہلی سی آزادی اور آسائش حاصل ہو چکی تھی۔

نہ تو شامی عیسائی ہی حروب صلیبیہ کے خواہاں تھے اور نہ ہی عیسائی جنگ آزماؤں کو اُن کے جذبات کی مطلق کوئی پرواہ تھی۔ وہ تو اُن کو بے دین و مرتد اور دخل در معقولات سمجھتے تھے۔ اگرچہ یہ ایک حیرت انگیز تعصب ہے لیکن اس کی ایک خاص تاریخی وجہ ہے۔

مشہور و معروف عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے ایک
دفعہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کیوں دوسرے تحائف کے
ساتھ بیت المقدس کے مشہور گرجے کی کنجیاں فرنکش
بادشاہ شارلیمن کو بھیج دیں تاریخی اعتبار سے یہ شامی
عیسائیوں کے ساتھ جو مغربی چرچ سے موافق نہ تھے
اور اسلامی حکومت کے سوائے کسی قسم کی حفاظت
کے طالب نہ تھے ایک شدید نا انصافی بلکہ زیادتی
تھی۔ سیاسی طور پر بھی یہ غلطی اسلامی حکومت کے لئے
ایک عذاب بن کر رہ گئی۔ یہ سچ ہے کہ چابیوں کی دو
جوڑیاں تھیں۔ گرجا روزانہ کھلتا تھا اور وہ اس وقت
تک برابر کھلا رہا جب شارلیمن شہنشاہ مغرب نے
اسے کھولنے کی خاطر مقفل نہ کرایا۔ چابیوں کا تحفہ تو
ایک لطیف اشارہ تھا کہ آپ اور آپ کے ساتھی اس
گرجا میں جو آپ کے مذہب کا مرکز اور مقام حج ہے
جب چاہیں بلا روک ٹوک آسکتے ہیں لیکن فرنکش عیسائیوں
نے بعد میں اس تحفہ کو کچھ اور معنے پہنا دیے اور انہوں
نے اپنے آپ کو گرجا کا مالک اور شامی عیسائیوں کو

محض راہب و غاصب کے درجہ تک گرا دیا۔ خلیفہ
طرف سے عیسائی بادشاہ کو یہ تحفہ صدیوں بعد فر
کے بڑے بڑے ناروا مطالبات کی بنا اور بالواسطہ
کے وسیع اور سنگین مطالبات کا دیباچہ قرار پایا کیو
روس رومن کیتھولک عیسائیوں کی پورش کے خلاف مشر
عیسائیوں کا محافظ بننا چاہتا تھا اور روس کا یہ
اور اُس کے مطالبات اُس تمام بدمزگی اور نزاع
باعث بنے جو مسلمانوں اور اُن کی عیسائی رعایا کے
درمیان پیدا ہوئی۔ جب عیسائیوں نے حروب صلیبیہ
میں یروشلم کو فتح کر لیا تو انہوں نے مسلمانوں کو قتل
اور مشرقی عیسائیوں کو بھی ساتھ ہی ساتھ تہِ تیغ کر دیا
وہ مشرقی عیسائی جو شام میں رہ گئے اور مسلمانوں کی
پیچھے ہٹنے والی فوج کے ساتھ نہ گئے نہ صرف نیچ
اور کم ذات ہی سمجھے گئے بلکہ اُن تمام امتیازات سے
جو اسلامی حکومت میں اُن کو حاصل تھے یکسر محروم
کر دیئے گئے۔ زندگی میں اچھا مرتبہ حاصل کرنے کے
لئے اُن میں سے بہت سے تو رومن کیتھولک بن گئے

جب مسلمانوں نے شام دوبارہ فتح کر لیا اور وہ
بائی جو ملک سے ہجرت کر گئے تھے واپس آئے
مشرقی عیسائیوں کو بلحاظ تعداد اُن عیسائیوں پر جو
پاپائے اعظم کے زیر اثر تھے بڑی اکثریت حاصل ہو گئی۔
بانا نظم و نسق اسلامی پھر سے بحال ہو گیا اور تمام
ئیوں کو شریعت کے عطا کئے ہوئے حقوق دوبارہ
رحمت ہوئے۔ لیکن بتقاضائے بشریت اُس مجنونانہ
ویزش نے مسلمانوں کے جذبات میں ایک تلخی ضرور
پیدا کر دی اور اُن کے دلوں اور دماغوں میں
عیسائیوں کے خلاف حقارت و ذلت کے جذبات بھی
جاگزیں ہو گئے۔

یہ نئی صورتِ حال دونوں قوموں کے لئے افسوسناک
تھی۔ اُس نے ایک طرف تو مسلمانوں کو معاشری طور پر
عیسائیوں کے خلاف تند و جابر بنا دیا دوسری طرف
عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کے جذبہ حقارت اور
فرومائیگی کو اتنی دیر تک قائم رکھا کہ مغرب دماغی ترقی
اور فوقیت میں اُن کو مات دے گیا اور مسلمان دیر

تک اس ترقی کی طرف سے آنکھیں بند کئے پڑے رہے
عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کا یہ کبر و غرور رفتہ رفتہ
راسخ ہو کر اُن کے دستورِ زندگی کا ایک جزو بن گیا
ابراہیم پاشا مصری نے جب انیسویں صدی کے تیسرے
عشرہ میں شام پر اپنا تسلّط قائم کیا تو مسلمانان دمشق
کا ایک وفد اُن کی خدمت میں یہ شکایت لے کر آیا
کہ اُن کے دورِ حکومت میں عیسائیوں نے گھوڑے
سواری شروع کر دی ہے ابراہیم پاشا نے بظاہر بڑی
ہی پریشانی اور اُلجھن کا اظہار فرمایا اور اجازت چاہی
کہ وہ ایک پوری رات اس ہولناک صورتِ حال پر غور
کر سکیں۔ اگلے روز صبح انہوں نے وفد کے روبرو
اعلان فرمایا کہ بلاشبہ عیسائیوں کا سواری میں مسلمانوں
کی برابری کرنا مسلمانوں کے لئے ذلّت کا مقام ہے اس
لئے مسلمانوں کو عیسائیوں سے ہر حال میں بلند رہنے
کے لئے آج سے اجازت ہے کہ وہ صرف اونٹوں
پر سوار ہُوا کریں۔ غالباً یہ پہلا موقعہ تھا جب دمشق
کے مسلمانوں کو اپنے مغالطہ کی نامعقولیت کا احساس ہوا

اعتراف ہوا۔
اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز تک مسلمانوں نے اپنی ذمّی عیسائی رعایا پر بعض معاشری قیود عائد کر دی تھیں لیکن وہ پابندیاں اُن روح فرسا قیود کے سامنے ہیچ تھیں جو عین اُس زمانہ میں رومن کیتھولک مزارعین پر عیسائی امراء نے عائد کر رکھی تھیں۔ یہ پابندیاں اُن مظالم اور نا انصافیوں کے مقابلہ میں ہیچ تھیں جو آئر لینڈ کے رومن کیتھولک پروٹسٹنٹ فرقہ پر ڈھا رہے اور روا رکھ رہے تھے۔ مسلمانوں کی عائد کی ہوئی پابندیوں کا اثر صرف امیر آدمیوں پر تھا۔ غریب مسلمان اور غریب عیسائی تو اس وقت بھی دلی دوست اور نیک ہمسائے تھے اور اُن میں ہر قسم کی مساوات تھی۔ مسلمانوں نے عیسائی ذمّیوں کی مذہبی آزادی میں کچھ مداخلت نہ کی۔ مسلمان حکومتوں کے زیر سایہ عیسائیوں کے لئے مذہبی تعزیرات یا سمتھ فیلڈ کی آگ کا کوئی قصّہ نہ تھا اور نہ ہی مسلمانوں نے اُن کے باہمی مذہبی فرقہ وارانہ تنازعات میں کسی قسم کی مداخلت کی۔

اس طرح عیسائیوں کے بعض چھوٹے چھوٹے فرقے جنہیں بڑے بڑے اور با اقتدار فرقے بے دین اور بدمذہب سمجھتے تھے اور جنہیں اگر بڑے بڑے فرقوں کے رحم وکرم پر ہی چھوڑ دیا جاتا تو اُن کا نام و نشان تک مٹ جانا لازمی تھا اسلام کے سایہ عاطفت میں آزاد و محفوظ چلے آتے ہیں۔

ایک وقت اسلامی سلطنت میں

لا تعداد عیسائی خانقاہیں جن کے خزائن و نوادر کی مالیت کا اندازہ کروڑوں پونڈ سے بھی زیادہ ہے سینا کے راہبوں کے نام پیغمبر خدا کے منشور آزادی کی بدولت مسلمانوں کے زیر سایہ پھلی پھولیں اور اُن کے انتہائی مذہبی احترام کی حقدار بنی رہیں۔ عیسائیوں کے مختلف فرقوں کو کونسل آف دی ایمپائر میں نیابت دی گئی۔ صوبہ دار اور ضلع دار کونسلوں میں اُن کے پادریوں کو حق نیابت حاصل تھا۔ ایسے مسائل میں جن کا تعلق صرف عیسائیوں ہی سے تھا اُن کے نمائندوں کی رائے بلاچون چرا

تسلیم کر لی جاتی تھی۔

عیسائی خانقاہوں سے متعلق مسلمانوں کے احترام کا ایک عجیب وغریب واقعہ خود مجھے یاد ہے۔ ۱۹۰۸ء میں بیت المقدس کے بڑے گرجا سے یونانی گرجا کے عربی بولنے والے یونانی عبادت گزاروں نے ملحقہ خانقاہ سینٹ جارج کے راہبوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس خانقاہ سے بہت بڑی جاگیر اور آمدنی متعلق تھی۔ اس خانقاہ کی آمدنی کا کثیر حصّہ اُن جائیدادوں سے وصول ہوتا تھا جو اس عرب جماعت کے آباؤ اجداد نے بد امنی و بدنظمی کے ایک دَور میں اس خانقاہ کے نام اس خیال سے کہ مسلمان مذہبی امانات اور اوقاف کا پورا پورا احترام کرتے ہیں اس شرط پر منتقل کر دی تھیں کہ بعد وضع مصارف آمدنی کا ایک حصّہ ان امانت داروں اور اُن کی اولاد کو خانقاہوں سے ملتا رہے۔ رفتہ رفتہ ان راہبوں نے اس جائیداد پر ایسا قبضہ جمایا کہ سو سال تک ان امانت داروں کے منشاء مقصد اور شرطِ انتقالِ جائیداد

کی خلاف ورزی میں ایک چھوٹی کوڑی بھی امانت داروں
اور اُن کی اولاد کے حصّہ میں نہ آئی۔
گرجا کے عبادت گزار اب مطالبہ کرتے تھے کہ پوری
ایک صدی کے اس غصب و خیانت سے کچھ نہ کچھ
رقم کم از کم اُن کے بچّوں کی تعلیم ہی کے لئے وقف
کر دی جائے۔ پطریق نے عوام کا ساتھ دیا مگر راہبوں
نے اُسے گرفتار کر لیا اور قید کر دیا۔ نمازیوں نے
خانقاہوں پر ہلّہ بولنا چاہا تو اُن دولتِ دُنیا سے مُنہ
موڑے ہوئے راہبوں نے اُن پر تیزاب چھڑکا۔ نمازیوں
نے ترکی حکومت سے اپیل کی تو پطریق کو رہا کرایا
گیا اور نمازیوں کے لئے کچھ مراعات حاصل کی گئیں۔
لیکن حکومت ترکیہ راہبوں سے مدّتوں کی نگلی ہوئی
دولت اُگلوا نہ سکی کیونکہ شریعت خانقاہوں کو آزاد و
خود مختار تسلیم کرتی ہے۔ عیسائیوں کے دلوں میں
جس بات نے ناسور ڈال دیئے وہ یہ تھی کہ جن
عیسائیوں نے ایسے ہی حالات میں بہ نظر حفاظت
اپنی جائیدادیں یروشلم کی مسجد الاقصےٰ کی امانت میں

دے دی تھیں اُنہیں برابر سالانہ آمدنی وصول ہوتی تھی۔
اسی ضمن میں ایک دوسرا دلچسپ واقعہ سُن لیجئے۔
سینٹ جارج کی خانقاہ کے ایک چھوٹے پادری نے
سینٹ جارج کی خانقاہ کے خزانوں میں سے مٹھی بھر
جواہرات اُڑا لئے جن کی مالیت چالیس ہزار پونڈ کے
قریب تھی۔ پادری ان جواہرات کو یورپ لے جانے کے
قصد سے بھاگا۔ ترکی کروڑ گیری کے افسروں نے
اُسے جافہ میں گرفتار کر لیا اور یروشلم واپس پہنچایا
پادری بے چارہ ترکی حاکم کے روبرو دھاڑیں مار مار
کر روتا تھا اور کہتا تھا کہ اُس پر ترکی قانون کے
ماتحت مقدمہ چلایا جائے لیکن مسلمان حاکم کا جواب
یہ تھا کہ عیسائی خانقاہوں پر اسلامی حکومت کو کوئی
اختیار حاصل نہیں۔ اس بدبخت کو آخر راہبوں کے
حوالہ کر دیا گیا۔ لیکن ترکوں کی اسلامی رواداری اور
بے تعصبی کے شواہد کو جو ذہبوں سے مراعات اور
حسنِ سلوک کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے اُن کے
سیاسی رقیبوں نے اُن کے خلاف ٹھیک اسی طرح

استعمال کیا جس طرح ترکوں کی طرف سے دَورِ عروج و اقتدار میں بخشی ہوئی مراعات کو اُن کے عہد زوال و انحطاط میں حقوق اور امتیازات کے پُر شکوہ نام سے پکارا جانے لگا ۔ اجازت دیجئے کہ مثال کے طور پر ایک ایسی ہی سیاسی رعایت کی تفصیل عرض کر دوں۔ تین سو سال پہلے صرف فرانسسکن راہب ہی مغربی یورپ کے عیسائی مبلغین تھے ۔ طاعون کی وبا بڑی شدّت سے پھوٹ پڑی اور شہروں کے شہر دنوں میں ماتم کدے بن گئے ۔ ان عیسائی راہبوں نے بلا امتیازِ مذہب و ملّت بیماروں کی نگہداشت کی اور مُردوں کی تجہیز و تکفین میں امداد دی۔ خدمت خلق کے اس جذبہ کے اعتراف میں اور بطور اظہارِ خوشنودی ترکی حکومت نے اعلان کر دیا کہ فرانسسکن درویشوں کا تمام مال ہمیشہ کے لئے محصول کروڑ گیری سے آزاد رہے گا اعلان شاہی میں لفظ فرنکش (یعنی مغربی یورپین) درج تھا ۔ بعد میں جب مغرب سے سینکڑوں مشنری پہنچ گئے جن میں سے اکثر رومن کیتھولک نہ تھے بلکہ دوسرے فرقوں سے تھے تو ان

رب نے اس اعلان کی رو سے اپنے لئے یہی رعایت طلب کی تو ترکی حکومت نے فرمان شاہی کے الفاظ کے پیشِ نظر سب مشنریوں کے لئے اس رعایت کو تسلیم کر لیا۔ لیکن ان لوگوں نے اس عطیہ شاہی کو اپنا ایک ایسا حق سمجھ کر طلب کیا جو انہیں کسی فاتح فوج کی شمشیر آبدار سے یا کسی بین الاقوامی معاہدہ سے حاصل ہوا تھا۔ ان مشنریوں نے اپنے ملک کے سفراء سے مطالبہ کیا کہ وہ حکومت کی طرف سے اُن کی سیاسی امداد کریں تاکہ اُن کو اپنے حقوق سے محروم نہ ہونا پڑے۔

عیسائیوں کو اپنی زبان اور روایات کے تحفّظ کا حق دیا گیا انہیں اجازت دی گئی کہ وہ اپنے مکاتب قائم کریں اور دوسرے ممالک سے عیسائی مبلّغین اُن کے پاس آسکیں۔ اس طرح مسلمانوں کے زیر سایۂ عاطفت اُن کی عالمگیر برادری کے اندر قومیت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے قائم ہو گئے جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں اسلام کے عالمگیر آغوش رحمت میں اُس

بے نظیر روا داری نے پرورش پائی جس تک پہنچ کر انسان نسل ، قبیلہ ، جماعت اور رنگ و خون کے بتوں کو توڑ دیتا ہے ۔

شام ۔ مصر اور میسوپوٹیمیہ میں جہاں قومیت اور زبان دونوں کا اتحاد تھا نصب العین کی کوئی آویزش رونما نہ ہوئی ۔ جہاں کہیں عیسائیوں اور مسلمانوں میں اختلافِ زبان موجود تھا وہاں مطمح نظر میں تفاوت ضرور نمایاں ہوئی ۔ جب تک اسلامی سلطنت اپنے نظم و نسق ۔ فارغ البالی اور تعلیم کے اعتبار سے عیسائی ممالک سے افضل رہی ۔ جب تک عیسائیوں نے اپنے جذبہ قومیت میں ایک شان پرخاش و رقابت پیدا نہ کر لی حاکم و محکوم کے درمیان کوئی تصادم پیدا نہ ہوا ۔ مسلمانوں کا پلّہ سترھویں صدی کے آغاز تک عیسائیوں کے مقابلے میں بھاری رہا ۔ اس کے بعد قریباً اسّی برس تک ترکی حکومت میں خرابیاں پیدا ہوتی رہیں اور عیسائیوں پر زیادتیاں شروع ہو گئیں جن کی وجہ آئین اسلامی کا نفاذ نہیں عدم نفاذ تھا ۔ پھر

بھی گذشتہ نظم و نسق کی عمدگی اور ذمیوں سے حسن سلوک
کا اثر اس حد تک موجود اور مؤثر تھا کہ روس کو اس
اسلامی سلطنت کے عیسائی ذمیوں میں معاندانہ جذبۂ
قومیت پیدا کرنے کے لئے ایک صدی سے زائد
مدت مسلسل خفیہ پراپیگنڈے میں صرف کرنی پڑی اور
طویل کوشش کے باوجود روس کو اس وقت تک
کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا جب تک ترکی
کی عیسائی رعایا میں ایک جنون مذہبی پیدا کرکے اسے
خوب ہی ابھار نہ لیا۔ اسی برس کی بدنظمی کے بعد
اصلاح کا وہ دور شروع ہوا جس میں اسلامی حکومت
نے اپنی رعایا کے ہر طبقے کی فلاح و بہبودی کی
بالارادہ کوشش شروع کی لیکن جب یہ کوشش شروع
ہوئی تو سرویوں۔ یونانیوں۔ بلغاریوں اور رومانیوں کی
واپسی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ روس کے مذہبی و سیاسی
پروپیگنڈے کا زہر اپنا کام کرچکا تھا اور ترکی پر روس
کی فتوحات نے یونانی عیسائیوں کے طبقہ اسفل میں
یہ امید پیدا کر رکھی تھی کہ انہیں جلد مسلمانوں پر

قتل غارت کا موقعہ حاصل ہو جائے گا جس کے لئے
روس کے خفیہ سفیروں - پادریوں اور راہبوں نے اُن
کے دل میں ایک امنگ اور تمنا پیدا کر رکھی تھی۔
میں تاریخ کے اس دَور سے مفصل بحث نہیں کرنا
چاہتا اگرچہ اس سے متعلق میری معلومات تشنہ نہیں۔ یہ
حال ہی کے واقعات ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ ان
کا اعادہ حاضرینؐ کے جذبات میں شدید اشتعال پیدا
کر دے گا۔ میں آپ کو صرف اس قدر جتانا چاہتا ہوں
کہ یونان کی جنگ آزادی میں ۱۸۲۱ء میں نہ صرف
موریہ کی تین لاکھ مسلم آبادی مرد - عورت - بچے اور
بڈھے سبھی شہید کر دیئے گئے بلکہ یونان کے شمالی
علاقوں میں بھی مسلمانوں کو ملیا میٹ کر دیا گیا۔ لیکن
تعجب اس پر آتا ہے کہ یورپین تواریخ میں اس قتل و
غارت کا تو ذکر تک نہیں لیکن ترکوں نے ان حملوں
کے سدِ باب کے لئے جو کارروائیاں اختیار کیں انہیں
خوب نمک مرچ لگا لگا کر اور مزے لے لے کر بیان
کیا گیا ہے خوب یاد رکھیئے کہ جب کبھی مسلمانوں نے

عہد حاضر میں عیسائیوں پر دھاوا بولا ہے وہ عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے وسیع قتل وخون کا جواب تھا۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے خون سے اپنی تلواروں کی پیاس بجھانے والے عیسائی مسلمانوں کے قدیم دوست اور ہمسائے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ آرمینین لوگ پچاس سال قبل تک ترکوں کے منظورِ نظر تھے اور اُن میں سے اکثر ترکوں کی حکومت میں نہایت خوش تھے جیسا کہ نام نہاد آزادی کے بعد ترکوں کے پاس اُن کی واپسی کی متعدد کوششوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

اسلامی سلطنت سے باہر کے عیسائیوں نے باقاعدگی اور تسلسل کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف اُن کے جنون مذہبی کو برانگیختہ کیا۔ اُن کے پادریوں نے انہیں بتایا کہ مسلمان کا قتل کارِ ثواب ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ترکی کی تباہی کی یہ سازش شرارت وکمینگی کی دنیا میں لاجواب ہے۔ کیا انسانی ترقی کے خلاف۔ آسمانی رہنمائی اور نوعِ انسان کے مقصود کے خلاف

اس سے نمایاں بغاوت ذہن میں آسکتی ہے۔ عیسائیوں
کی اس ناپاک و نامراد کوشش کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہبی
رواداری اہلِ دنیا کی نظر میں ایک خوبی نہیں کمزوری
اور گناہ بن گئی ہے کیونکہ لاکھوں عیسائی جو ترکی کے
زیر سایہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے
اس کے زوال کا باعث بنے۔ دوسری طرف مذہب
کے نام پر تعزیر و تباہی کو جو عالم عیسائیت میں
عام رہی ہے ایک معقول و محفوظ مسلک سمجھا گیا ہے
مذہبی رواداری کو اس طرح سیاسی حماقت ثابت کیا
جاتا ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اصل میں مظلوم
سے زیادہ ہمارے رحم کا حق دار ظالم ہے ہسپانیہ
کا زوال مسلمانوں کے اخراج کی تاریخ سے شروع ہوا
سان فرینڈو مفتوح سیوائیل۔ موریکا اور ٹولیڈو کے ساتھ
روادارانہ سلوک کرنے میں اپنے ملک کا بہتر بہی خواہ
تھا بہ نسبت اپنے اُس جانشین کے جس نے جہاد کی
امنگ میں غرناطہ پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں اور یہودیوں
پر تعزیر مذہبی کے جنون و جہنم کے دروازے کھول دیئے

موجودہ بلقانی ریاستیں اور یونان ایک لعنت کی پیداوار ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ مغربی تہذیب کا زوال اُس روز سے شروع سمجھا جائے جس روز مہذّب سیاستدانوں نے عہد زار کے روس کی ظالمانہ اور خلاف انسانیت حکمت عملی پہ اتفاق کر لیا اور روسی چرچ کے جنون مذہبی کی پیٹھ ٹھونکی۔ بلا شک و شبہ تاریخ کی نظر میں مذہبی روا داری اقوام کی تہذیب و ثقافت کی روشن ترین دلیل ہے۔

کسی مسلمان کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ ایک اسلامی سلطنت کی اُس اندوہناک تباہی کو دیکھ کر جو اُن لوگوں کے ہاتھوں عمل میں آئی جنہیں مسلمانوں نے اپنے ہاں صدیوں پناہ دی اور اپنے زمانے بھر آرام و احترام سے رکھا جب مغربی یورپ میں دوسرے مذاہب کے سب لوگوں کو ملیا میٹ کر دینا یا اپنے مذہب میں شامل کر لینا ایک مقدّس مذہبی فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ کسی مسلمان کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ ان حالات کے پیشِ نظر روا داری کی اسلامی تعلیم کو

اسلام کی کمزوری خیال کرے رواداری اسلام کی سب سے بڑی قوت ہے کیونکہ مسلک حق و صداقت یہی ہے جو آج کی طرح صرف یہودیوں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں ہی کا خدا نہیں جس طرح اس کا باران رحمت محض یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص نہیں۔ پھر بھی ہمیشہ کی طرح آج بھی بعض لوگ کہتے ہیں۔

لن یدخل الجنۃ الّا من کان ھودا او نصاریٰ

کوئی جنت میں نہ داخل ہوگا سوائے اس کے کہ وہ یہودی یا عیسائی ہو۔

ایسے لوگوں کو قرآن کریم کا جواب سنا دو۔

بلیٰ من اسلم وجھہٗ للّٰہ وھو محسن فلہٗ اجرہٗ عند ربہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

خطبہ ششم

تقدیر پرستی

میں نے آپ حضرات کے روبرو اسلام کے جاہ و جلال اور انحطاط و زوال کی داستان عرض کی ہے۔ اسلام کے زوال کو اس کی ایک جبلی کمزوری یعنی تقدیر پرستی پر محمول کرنا آج ایک گونہ فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو اسلامی تہذیب کی عظمت و شان اور اس مرتبہ بلند کو جو مسلمانوں نے حاصل کیا اور جس پر وہ عہد اولیں فائز رہے تھے

کس چیز پر محمول کیا جائے گا۔ منطقی طور پر ہمیں بلاشبہ اسلام کی اسی جبلی تقدیر پرستی ہی کو اس کی عظمت و شان کا سبب تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ تو ناممکنات سے ہے اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ تقدیر پرستی اسلام کا ایک جبلی عیب ہے تو اس سورج سے بھی زیادہ واضح حقیقت کی کیا توجیہہ پیش کی جائیگی کہ جب تک مسلمانوں نے اپنے عقائد مذہبی کی ہوشمندانہ متابعت کی تو وہ سراپا کردار بنے رہے اور ہر میدان میں انہیں انتہائی کامرانی نصیب ہوئی اور جب انہوں نے تعلیماتِ اسلامی کو پس پشت ڈال کر احکام دینی کے سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے سے انحراف کیا تو اسی نسبت سے ان پر سستی و کاہلی چھا گئی وہ تن آسانی میں مبتلا ہو گئے اور ان پر ادبار و انحطاط مسلط ہوتا گیا۔ بلا شبہ تاریخ کے بعض ادوار میں دنیائے عیسائیت کی طرح عالم اسلام میں بھی مسئلۂ جبر و اختیار ہنگامہ و ہیجان کا موجب رہا ہے۔ قرآنِ کریم میں اختیار کی حدود پوری وضاحت سے متعین ہیں اللہ تعالیٰ

کی قدرت مطلقہ و کاملہ تو بلا شبہ مسلّم ہے اُس میں انسان کو ایک حد تک اختیار سے سرافراز فرمایا گیا ہے لیکن اپنے حلقۂ اختیار میں بھی انسان کو مکافات کے قانونِ ربّانی سے کوئی مفر نہیں۔

اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ط وَاِنْ تُصِبْھُمْ حَسَنَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِکَ ط قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ط فَمَالِ ھٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَکَادُوْنَ یَفْقَھُوْنَ حَدِیْثًا ہ مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَ مَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ ط وَ اَرْسَلْنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ط وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا ہ

ترجمہ۔ جہاں کہیں ہو تم پا لے گی تم کو موت اگرچہ ہو تم بلند برجوں میں اگر اُن کو بھلائی پہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر بُرائی انہیں پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے تم کہہ دو کہ سب اللہ کی طرف سے ہے اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ بات نہیں سمجھتے۔ جو کچھ تجھے بھلائی پہنچی اللہ

کی طرف سے ہے اور جو بُرائی پہنچے وہ تیرے نفس
کی طرف سے ہے ہم نے تجھے تمام لوگوں کے لئے
رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔

یہی دو آیات ہیں جن پہ جبر و اختیار سے متعلق مباحث کی گرمجوشیاں مرکوز رہی ہیں بظاہر اُن میں ایک گونہ تضاد پایا جاتا ہے۔ فی الحقیقت اُن کا اشارہ مسلمانوں کی ایک خاص شکست کی طرف ہے جس میں بعض مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا جب ہم اُس واقعہ اور مسلمانوں کی بڑبڑاہٹ کو پیشِ نظر رکھیں تو اس سلسلہ میں ہماری تمام مشکلات رفع ہو جاتی ہیں۔ موت انسان کے اختیار و اقتدار سے بالاتر ہے اور دیر سویر ہر شخص کو آن ہی لیتی ہے۔ انسان قسمت کے نشیب و فراز کے تابع ہے اور وہ بھی اُس پہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آتے ہیں۔

"اُن لوگوں کو کیا مرض ہو گیا ہے کہ سیدھی
سادھی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے"

قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو متعدد بار دُہرایا ہے

کہ رسول اکرمؐ ایک بشر تھے فوق البشر نہ تھے۔ مسلمانوں
کی محولہ بالا مصیبت خود اُن کی ہی باہمی نزاع و
نااتفاقی کا نتیجہ تھی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو
ان امور سے باز رہنے کی ہدایت فرمائی ہے جب
وہ احکام خداوندی کی متابعت کرتے تھے تو جدھر رُخ
کرتے تھے کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہوتے تھے۔
قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے۔

"جو اچھائی ظاہر ہوتی ہے اے بندے وہ اللہ
کی طرف سے ہی ہے اور جو بدبختی نازل ہوئی
وہ خود تمہاری طرف سے ہے"

پیغمبر علیہ السلام مکافاتِ عمل کے قانونِ الٰہی
کے بدل ڈالنے پر قادر نہیں۔ بلا شبہ تعلیماتِ اسلامی
میں اور قرونِ اولےٰ کے مسلمانوں کی زندگی میں تقدیر
پرستی کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں لیکن اس تقدیر پرستی
کی نوعیت وہ نہیں جس سے مغرب آج مسلمانوں کو
مطعون کرتا ہے۔ اس تقدیر پرستی میں سہل انگاری اور
تن پرستی و آساں کوشی کے لئے تو قطعاً کوئی گنجائش

نہیں۔ مغرب میں یہ غلط فہمی ترکوں کے اعمال کے مشاہدے بلکہ ناکمل مشاہدے سے پیدا ہوئی۔ ترک سپاہی نژاد ہیں انہوں نے جنگ کو تو حقیقی زندگی اور امن کو اپنی 'رخصت' سمجھا۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ لوگوں نے بحث و تمحیص کے لئے ان آیات کو منتخب کیا۔ میری رائے میں قرآن کریم کی سینکڑوں دوسری آیات میں جبر و اختیار کے وسیع تر مسائل سے بہتر اور زیادہ نتیجہ خیز بحث کی گئی ہے۔ مسئلہ جبر و اختیار تو مسئلہ ابدیت کی طرح ہمارے فہم سے بالاتر اور اُن مسائل میں سے ہے جن پر قرآنِ حکیم نے کسی شرح و بسط کی ضرورت نہیں محسوس کی اور ہمیں اُن میں اُلجھ کر رہ جانے سے باز رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ انسان کو تو دُنیا میں نیابتِ الٰہی کا مرتبہ حاصل ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ج وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ

وَ نُقَدِّسُ لَکَ ط قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝

ترجمہ۔ اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کیا تو (اسے) بناتا ہے جو اس میں فساد کرتا ہے اور خون گراتا ہے اور ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ فرمایا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

جب تک انسان اپنی بیچارگی کا معترف ہے اور اُن اختیارات کو جو اُسے تفویض ہوئے ہیں ایک مقدس امانت سمجھتا ہے اُس کے لئے بہتر ہے۔ جب وہ اپنی بیچارگی کو بھلا دیتا یا اُس سے انکار کرتا ہے تو وہ غلط راستے پر پڑ لیتا ہے اور وہ خسارے میں رہے گا۔ اس سورہ میں جو گمان کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے نازل ہوئی ارشاد ہوتا ہے :-

کَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۝ۙ اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی ۝ؕ اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجۡعٰی ۝ؕ

ترجمہ - بیشک انسان سرکشی کرتا ہے کہ اپنے آپ
کو بے نیاز دیکھتا ہے اللہ ہی کی طرف ہی ہے پھر جانا۔

انسان کو اس دنیا کی حکومت عطا کی گئی اور اس
میں حیوانات اور نباتات اور جمادات کی قبیل سے
جو کچھ ہے اُس پر اُسے قدرت دی گئی ہے اِس
کا ذمہ ہے کہ ان اشیاء کو بنی نوع انسان کی
بہبودی کے لئے ترقی دے اور بہتر بنائے اور
ذاتی خوشی و خواہش کی خاطر انہیں تباہ و برباد نہ
کرے۔ اُسے اپنے ہم جنسوں کے لئے بھی ذمہ دار
گردانا گیا ہے اور اُسی کا فرض ہے کہ بنی نوع
انسان اور اُس کی آئندہ نسلوں کی ترقی و بہتری میں
دل و جان سے کوشاں رہے۔

قوانین فطرت پر جو تمام کائنات میں جاری و ساری
ہیں انسان کا قطعی انحصار۔ اُن قوانین کی متابعت کے
بغیر جو اُس کے وضع کئے ہوئے نہیں انگلی ہلانے یا
سانس لینے کی عدم مجالی۔ رات اور دن کا منظر اور
تواتر اور وہ قانون مکافات جس کے تابع اُس کے

تمام افعال ہیں یہ تمام امور انسان کے لئے اُن کی مستقل انتباہ ہیں کہ اُس کے اختیار و فرمانروائی کی حادود قطعاً معین اور ہمیشہ ایک حد درجہ برتر طاقت کے رحم وکرم پہ موقوف ہیں لیکن انسان ان تمام نشانیوں کے باوجود اس سیدھی سی بات کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ اور پھر یہ ارشاد ہُوا ہے۔

"انسان باغی ہے اور اپنے آپ کو مختار سمجھتا ہے" اور بُرائی اور گناہ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

مسلمان مرد اور عورت پہ اس حقیقت کی اشاعت اور دنیا میں مملکت الٰہیہ یعنی عالمگیر اخوّت کے قیام کی کوشش لازم کر دی گئی ہے مملکت الٰہیہ کسی فرقے یا نسل کے لئے محدود و مخصوص نہیں کر دی گئی چند معتقدات کا اعلان یا چند شعائر کی پابندی معیار صداقت نہیں۔ معیار تو دنیا بھر کے لئے ایک ہی ہے اور وہ ہے عمل۔

جہاد

مسلمان پر جہاں کہیں اور جب موقعہ پیش آئے خیر و اصلاح کے قیام و حصول اور فساد و شر کے استیصال کی کوشش لازم ہے۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کے قیام کی غرض سے اپنے آپ کو اُس کی رضا پر وقف کر چکا ہے ۔ اس کا نتیجہ تساہل و تغافل یا مراقبہ کی سربزیری نہیں ہے۔ یہ اقرار و اعتراف تو اُس کے لئے ایک بالارادہ جدوجہد کا نام ہے جس کی تمام مشکلات اور سختیاں اس کے لئے رنج و دلگیری کے بجائے مسرّت و آسودگی کی اُسی نوعیت کی سرمایۂ دار ہے جو مخالف طوفانوں سے لڑنے والے اُس تیراک کو اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب طوفان تھم جاتا ہے اور وہ لہریں جن کے تھپیڑے اُسے غرقاب کرنے پر تلے ہوئے تھے اُسے اپنے دوش پہ سوار اس کی منزل مقصود کی طرف لئے جاتی ہیں۔

خیر کی حمایت اور شر کی مخالفت میں مسلمان کی یہی جد وجہد جو اس کی ذات سے شروع ہو کر اُس کے ہم جلسوں تک کو اپنی لپیٹ میں لے آتی ہے اور جس کی انتہائی صورت موقعہ پڑے تو میدانِ جنگ میں جام شہادت نوش کرنا ہے جہاد کہلاتی ہے۔

جہاد میں مسلمان اپنے مال و منال دنیوی اور ہر اُس شے کو جو اُسے عزیز ہے اللہ کا نام لے کر چھوڑ دیتا ہے اور اُسے اس امر کی پرواہ نہیں ہوتی کہ موت اُسے کب اور کہاں آن لیتی ہے۔ یہی مسلمانوں کی اصلی تقدیر پرستی ہے لیکن یہ وہ تقدیر پرستی ہرگز نہیں جس کا نتیجہ جمود و انحطاط ہو جب مسلمان امن کی عشرتوں اور دولت کی مستیوں میں جذبہ جہاد سے محروم ہو گئے اور انھوں نے اس اصلاح دینی کے ہمہ گیر مفہوم کے عوض اس کا وہ محدود مفہوم قبول کر لیا جس میں علمأ نے اُسے مقید کر دیا تھا تو تہذیبِ اسلامی کا انحطاط و زوال

شروع ہو گیا۔

لفظ 'جہاد' کی عالمگیری کو جس طرح محدود و محبوس کر دیا گیا ہے کسی دوسرے لفظ کے مفہوم میں یہ انقلاب کبھی کم ہی نظر آیا ہو گا اور نہ ہی قوموں کے لئے الفاظ کا تغیرِ مفہوم اس قدر ہلاکت خیز ثابت ہوا ہو گا۔ غیر مسلم تو جہاد کو بالعموم کشور کشائی کے لئے ایک جنگ ہی سمجھتے رہے ہیں جس میں مسلمان کا کام ہر غیر مسلم کو زیر کرنا ہے اُن کے خیال میں جہاد تو حروب صلیبیہ کی قسم کے مجنونانہ ہنگامے کا نام ہے۔ غیروں کا تو کیا کہنا خود مسلمانوں نے بھی آج جہاد کا مفہوم ایسی جنگ ہی سمجھ رکھا ہے جو اسلام کی حفاظت کے لئے لڑی جائے یہاں تک کہ خلیفہ اور اُس کے نائب خدیو مصر کا محکمہ جنگ النظارۃ الحربیہ نہیں النظارۃ الجہادیہ کہلاتا تھا اور اس کی وجہ یہ خوش فہمی تھی کہ اسلامی برادری کے سردار اعلیٰ کے زیر فرمان جو جنگ لڑی جائے گی اس کی نوعیت ہمیشہ جہاد ہی کی سی ہو گی۔

فوج کے ارباب اختیار کے لئے یہ آڑ ضروری تھی کیونکہ ازروئے شریعت مسلمانوں کو صرف اسی جنگ کے لئے پکارا جا سکتا ہے جس کی نوعیت جہاد کی سی ہو۔ پس جبری بھرتی کے لئے ایک مستقل حکم کا یہی جواز ہو سکتا تھا کہ تمام جنگیں جن میں اسلامی افواج کو دعوت شرکت دی جائے گی لازماً جہادی نوعیت ہی کی ہوں گی کیونکہ وہ عالم اسلام کے علماء کے نمائندے یعنی شیخ اسلام کے جواز جہاد کے فتوے کی بنا پر خلیفۃ المسلمین کے اعلان کے بعد شروع کی جا سکتی تھیں۔

پہلے زمانے میں جب اسلامی یونیورسٹیاں اپنے اثر و اقتدار کے عہد شباب میں تھیں علماء کی حق پرستی آزادی اور بیباکی مسلم تھی۔ وہ جہاد اور اُن جنگوں میں جو ذاتی مفاد اور ہوس ملک گیری کے لئے لڑی جاتی تھیں امتیاز کرتے تھے۔ وہ کشور کشائی اور ملک گیری کی جنگوں کو ہمیشہ خلاف شرع قرار دیتے تھے۔ اگرچہ ایسے علماء بادشاہوں کی جوع الارض کا انسداد نہ کر سکے لیکن ان جنگوں پہ انہوں نے اس قدر شدید پابندیاں

ضرور عائد کر دیں جن کی بدولت یہ جنگیں عوام کے لئے باعثِ اذیّت اور وجہ ضرر نہ رہیں۔ چنانچہ کوئی بادشاہ نہ تو کسی مسلمان کو کسی ایسی جنگ میں اپنی حمایت میں شمولیت پر مجبور کر سکتا تھا اور نہ ہی عام مسلمانوں سے اس مقصد کے لئے کوئی ٹیکس وصول کر سکتا تھا۔ اگر ایک مسلمان بادشاہ کسی دوسرے بادشاہ سے جنگ کرتا تھا تو اُسے ایسی جنگ کے مصارف کا خود ہی کفیل ہونا پڑتا تھا۔ اُس کی فوج یا تو اُس کے زرخرید غلام ہوتے تھے یا ایسے لوگ جو اپنی خوشی سے اُس کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے تھے۔ بادشاہ اور اُس کی فوج کو پُرامن مسلمانوں کے جان و مال اور ذرائعِ معاش سے کسی قسم کے تعرض کی اجازت نہ تھی۔ پُرامن مسلمانوں کو اگر کوئی گزند پہنچائی جاتی تو علمأ بادشاہ کو اُس کیلئے قابلِ تعزیر ٹھیراتے تھے اور اُن کے اختیار و اقتدار کا یہ عالم تھا کہ وہ ایسے مجرم کے خلاف تمام عالم اسلام کو برانگیختہ کر سکتے تھے۔ پس ایسی جنگیں تہذیبِ اسلامی اور اُس کے ثبات و استحکام کو کوئی ضعف نہ پہنچا سکتی

تھیں۔ عوام فوجوں کو جنگ پر جاتے دیکھتے تھے اور اپنے اپنے کاموں میں کامل اطمینان سے مشغول رہتے تھے اُن کے لئے اس قسم کی جنگ میں فتح و شکست کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی کیونکہ بادشاہوں کا آنا جانا اُن کے لئے کسی قسم کے انقلاب کا موجب نہ ہوتا تھا۔ قوانینِ شریعت سب کے لئے مساوی تھے اور ہر فرمانروا پر اُن کی متابعت لازم تھی۔ احکامِ شریعت سے سرتابی کی صورت میں علمأ اُسے تمام دُنیا میں ذلیل و رسوا کرنے کے لئے موجود تھے۔ اسی طرح علمأ سلف نے غیر مسلموں کے خلاف مسلمانوں کی ایسی جنگوں کی بھی پُر زور مذمت کی جن کی بنا ایک کھُلے ہوئے ظلم و عدوان کے خلاف ایک واضح انصاف دینکی کی حمایت نہ ہو۔ اگر وہ تمام جنگیں جو مسلمانوں نے تاریخ عالم میں لڑی ہیں تمامتر اُسی طرح جذبۂ جہاد کے ماتحت لڑی جاتیں جیسے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا عمل تھا تو آج تمام دنیا حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکی ہوتی اور انسان اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بلند تر اور محکم تر نظر آتا۔

جہادی جنگیں اسلامی ممالک کی مدافعت مظلوموں اور ناتوانوں کی حفاظت و حمایت اور نا انصافیوں کے ازالہ کے لئے لڑی جانی چاہئیں۔ ان جنگوں میں غیر حربیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیئے۔ مذہبی پیشواؤں اور مذہبی شعائر کا احترام لازم ہے فصلیں برباد نہ کرنی چاہئیں۔ پھلدار درختوں کے کاٹنے کی ممانعت ہے اور اسی طرح ارشاد ہے کہ "ان کے ذرائع معاش برباد مت کرو" دشمنوں کے لئے یہی آئینِ محمدؐ تھا۔ اسی آئینِ رحمت کا مقابلہ عالمگیر جنگِ اوّل (اور دوم) میں جدید یورپ کے عمل سے کیجیئے جس میں دشمن کو ہر طریق سے فاقوں مارنا جائز سمجھا گیا۔ پھر دونوں میں سے جو آئین پسند خاطر ہو اختیار فرمائیے۔ پیغمبرِ اسلام کا منشأ جنگ کی ہولناکیوں اور ہلاکت خیزیوں میں کمی کر کے اُسے مقابلتاً نرم کرنا اور مفتوح کے لئے اُس کے نتائج و عواقب کو اس قدر فیض رساں بنا دینا تھا کہ لوگوں کے دل اسلام کی طرف کھنچ آئیں اور اس طرح دُنیا میں ایک دَور امن و سلام کا آغاز ہو۔ عہدِ رسالت میں اس خیال

کا قطعاً کوئی وجود نہ تھا جو بعد میں کبھی کبھی مسلمانوں کے دل میں پیدا ہوتا رہا کہ کافروں کے خلاف جنگ کرنا اُن کا ایک مقدّس فریضہ ہے۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں سے جو شخص صلح کا طالب ہوتا تھا اُس سے صلح کی جاتی تھی اور جب تک وہ اپنے عہد و پیمان پہ قائم رہتا تھا اُسے برابر کے حقوق حاصل رہتے تھے۔ مسلمانوں کا احترام معاہدہ اور پاس عہد ضرب المثل ہو گیا تھا۔ قرآن کریم ہر معاہدہ کو مقدس قرار دیتا ہے اور مسلمانوں نے اسی سلسلہ میں اپنی شہرت کو برقرار رکھا ہے۔ جہادی جنگیں ثقافتِ اسلامی کا ایک جزو تھیں اور آج اقوام عالم کو اس کے مطالعہ و تقلید سے بہت فائدہ ہوگا۔ پیغمبر اسلام نے اپنی جنگوں میں متعدد مرتبہ اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا اور اس عفو کے نتائج حد درجہ حیرت انگیز تھے۔ اسلامی تعلیمات میں ایک بات البتہ ایسی ہے جس پر ایسے لوگ جو ہر حال میں مخالفین جنگ ہیں معترض ہوں گے اور وہ حفاظت خود اختیاری۔ ناتوانوں اور

بے بسوں کی اعانت اور ظلم و عدوان کے خلاف جنگ یعنی بعض مخصوص حالات میں مقاتلہ کا حکم ہے اسی حکم کو اسلام کے خلاف ایک حد درجہ شرمناک تہمت تراذی کی بنا قرار دے لیا گیا ہے۔ مسٹر لائیڈ جارج (وزیراعظم برطانیہ) نے جنیوا کانفرنس میں اور اسی زمانے میں ایک ہندوستانی جج نے قرآن کریم کے الفاظ "انہیں جہاں پاؤ قتل کر دو" کو دہرایا لیکن ایسا کرنے میں اس حکم کو اس کے سیاق و سباق سے یکسر علیحدہ کر لیا گیا تا آنکہ اس کا مفہوم یہ نظر آنے لگے کہ گویا مسلمانوں پر حکم الٰہی کے ماتحت غیر مسلموں کا قتل ہر جگہ ہر مقام اور ہر زمانے میں فرض قرار دیا جا رہا ہے اجازت دیجئے کہ میں پورا اقتباس پیش کر سکوں۔

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ○ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْکُمْ فِیْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْکُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ

كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ○ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ط فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ○

ترجمہ۔ لڑو اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اُن کو مارو جہاں کہیں تم اُن کو پاؤ اور اُن کو نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے اور فتنہ (فساد) زیادہ شدید ہے قتل سے۔ اور اُن سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو جب تک وہ تم سے نہ لڑیں اگر وہ تم سے لڑیں تو اُن کو قتل کرو۔ ایسا ہی بدلہ ہے کافروں کا اور اگر وہ باز رہیں تو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے اُن سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور سب کا سب دین خدا کے لئے ہو جائے۔ اگر وہ باز رہیں تو کوئی زیادتی نہ کرنا مگر اوپر ظالموں کے۔

کون صاحبِ ہوش اسے قتل عام کا حکم اور جانستانی

کا جواز سمجھے گا۔ یہ تو محض ایک اصول جنگ ہے جو
سادہ ترین الفاظ میں اُن لوگوں کے روبرو بیان کیا
گیا ہے جنہوں نے اُس وقت سے پہلے تک انسان
کی جان لینا ہر حالت اور ہر صورت میں ناجائز سمجھا
تھا کیونکہ مسلمان اس حکم کے نزول سے پہلے مخالفین
جنگ میں سے تھے اور اس حکم کی متابعت میں
بھی انہیں اپنا مذہب تسلیم کرانے کے لئے نہیں بلکہ
اپنے لئے آزادیٔ عقائد کی خاطر اُن لوگوں سے
نبرد آزما ہونا تھا جو مسلمانوں کو طرح طرح سے اذیتیں
پہنچا رہے تھے اور اسلام کو (نعوذ باللہ) بیخ و بُن سے
اُکھاڑ پھینکنے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔ مسلمانوں
کو تو اُس وقت تک جنگ کرنے کا حکم دیا گیا تھا
جس وقت تک عقوبت مذہبی کا خاتمہ ہو جائے اور
لا اکراہ فی الدین کے اصولِ قرآنی پر عملدرآمد شروع
ہو اور دین میں پوری پوری آزادی مسلّم ہو جائے
تا آنکہ سب کے لئے دین کا معیار عمل ہی قرار پا جائے۔
کیونکہ اللہ سب کا ہے اور اُسے مخصوص گروہوں اور

فرقوں سے کوئی خاص چاہت نہیں۔ ایک مسلمان کو
دنیا بھر میں کسی مجمع سے یہ کہنے کی ضرورت نہ پیش
آنی چاہیئے تھی لیکن اس بارے میں دنیا کی جہالت
انتہا ہے اور مجھے یہ اعلان کرنے کی ضرورت پیش
آئی ہے کہ قرآن کریم میں قتل یا قتل عام کا کسی
حالت میں بھی قطعاً کوئی جواز نہیں لیکن بعض واضح حالات
میں ایک واضح اور آبرومندانہ جنگ کا حکم ضرور موجود
ہے لیکن اس حکم پر ایسی پابندیاں عائد ہیں جن پر
اسلام کی کامرانی کا بہت کچھ دارومدار رہا ہے کیونکہ
اسلامی نظام جنگ نے اُن لوگوں کو جو جنگ کی ہمہ گیر
ہلاکتوں اور بربادیوں کو دیکھنے کے عادی تھے ورطہ حیرت
میں ڈال دیا۔ اسلام میں جنگ صرف ایک ہی ہے
اور وہ جہاد کی انتہائی صورت ہے جہاد جدوکوشش
کا نام ہے۔ جہاد کا دینی مفہوم اُس تمام جدوجہد پر
حاوی ہے جو ایک سچے مسلمان کو قرآن کریم کی متابعت
میں مدت العمر ایسے فرائض دینی کی ادائیگی میں اختیار
کرنی پڑتی ہے جو ہر عمل میں اس کا معیار ہیں۔ اُس

کا مقصد انسانوں کے دلوں میں خدا کی حاکمیت کا قائم کرنا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ سچا مسلمان نہیں۔ یہ کوشش تو مسلمان کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں خیر کے لئے شر کے خلاف ایک جنگ ہے اور اس کا آغاز خود مسلمان کے قلب سے ہوتا ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے۔ الجہاد الاکبر الھویٰ۔ سب سے بڑا جہاد خود انسان کی ہوا و ہوس کے خلاف جنگ ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی احکم الحاکمینی اور اخوّت اسلامیہ کے حقوق کی توسیع کا بہترین طریق خود مسلمان کے لئے ذاتی نیک مثال کا قائم کرنا ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے تحصیل و اشاعت علم کی کوشش کو بھی جہاد الاکبر ہی کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے " طالب علم کی روشنائی خونِ شہید سے زیادہ مقدّس ہے "

اصطلاح جہاد کا اطلاق اس کوشش پر بھی ہے جو ایک فنکار تکمیل ہنر کے لئے اختیار کرتا ہے اور اُس کوشش پر بھی جو اُن لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے

جو وبا زدہ مقامات میں بیماروں کے علاج معالجہ اور مُردوں کی تجہیز و تکفین کی خاطر موجود رہتے ہیں ضرورتمندوں کی مال سے حاجت برآری اور جبر و ظلم کی صبر سے برداشت غرض ہر انسانی کوشش جس کا منشا اصلاح حال۔ صداقت کی حمایت اور ظلم کا استیصال ہو جہاد ہی کہلاتی ہے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی تجارت جہاد ہی تھی کیونکہ سوداگر جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر گھروں سے نکل جاتے تھے۔ اُن کا جذبہ تبلیغ ہی اُن کا سلاح جہاد تھا۔ انہیں اپنے کاروباری طریقوں کی صداقت پر ناز تھا۔ وہ اپنے معاہدات کا ہر حالت میں احترام کرتے تھے اور جہاں کہیں اُن کے قدوم میمنت لزوم پہنچے قرآن کا پیغام بھی پہنچا۔ عرب سوداگروں میں جذبۂ تبلیغ آج بھی اپنی پرانی صداقت و گرمجوشی کے ساتھ موجود ہے۔ اندریں حالات جہاد کے مفہوم کو صرف جنگ اور وہ بھی مذہبی جنون کی جنگ تک محدود کر دینا ایک المناک غلط بیانی ہے۔ حالانکہ ہر مسلمان کو بلکہ ہر آس انسان کو

جو اس خطاب کا سزاوار ہے ہمیشہ ایسے مقاصد کی حفاظت کے لئے جن کی صحت و صداقت پر اُسے یقین کامل ہے دقت پڑنے پر اپنی جان کی بازی لگا دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے. جہاد اور اُس جنگ میں جو جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر لڑی جاتی ہے اور جو تقاضا کرتی ہے کہ ایک شخص کو اپنے ملک کی خاطر خواہ ملک حق پر ہو یا باطل پر ہر صورت میں جان دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے مختلف ہے. اسی سلسلہ میں پیغمبرؐ اسلام نے ارشاد فرمایا ہے :-

"وہ ہم میں سے نہیں جو ناانصافی میں اپنے قبیلے کا ساتھ دیتا ہے. وہ ہم میں سے نہیں جو دوسروں کو ظلم میں شمولیت کی دعوت دیتا ہے اور وہ ہم میں سے نہیں جس کی موت اس حالت میں ہو کہ وہ ظلم میں اپنے قبیلے کی امداد کر رہا ہو"

حضور سرور کائنات نے ایک مرتبہ اس ارشاد قدسی سے سامعین کو حیرت میں ڈال دیا " اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو جب وہ اچھا کام کر رہا ہو اور جب وہ برا کام کر رہا ہو " صحابہؓ نے عرض کیا " حضور کیا ہم ظلم و زیادتی میں مسلمان بھائی کی مدد کریں " ارشاد ہوا " ہاں ۔ خاص کر جب وہ برا کام کر رہا ہو ۔ اس کا ہاتھ پیچھے کھینچ لو "

مسلمان وہ ہیں جو قرآن کریم کی اصطلاح میں جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہوتے ہیں یعنی اپنی اور کمزوروں اور ستائے ہوؤں کی حفاظت کے لئے اور ظلم و عدوان کے استیصال کے لئے جنگ کرتے ہیں ۔ اسلام اقوام و افراد کے خلاف محض اختلاف مذہب کے لئے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی ایسی جنگوں کو جہاد کے مقدس نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے ۔جہاد تو جہد فی سبیل اللہ ہے اور اگر ہم عہد حاضر کی زبان میں اسے بیان کرنا چاہیں تو ہم کہیں گے کہ جہاد بنی نوع انسان کی ترقی

کے لئے ایک تعلق قلبی اور شیفتگی کی راہ ہے۔ بلاشبہ جب کوئی قوم مسلمانوں پر مظالم توڑے۔ انہیں نیست و نابود کرنے اور غلام بنا لینے کے درپے ہو اور بزورِ شمشیر حق کو دبا دینا چاہے تو بلا شبہ تمام مسلمانوں کو ایسی قوم کے خلاف جنگ کرنے کا حق اور حکم ہے۔ اگرچہ جہاد یعنی نیکی کے لئے جد و جہد مسلمان کا مقدّس فریضہ قرار دے دیا گیا ہے لیکن انہیں یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ اللہ اُن کی کوششوں کا محتاج ہے

ومن جاھد فانما یجاھد لنفسہ ان
اللہ لغنی عن العلمین۔

ترجمہ۔ جو کوئی کوشش کرتا ہے اپنی بھلائی کے لئے
کرتا ہے۔ اللہ کو اپنی مخلوق کی امداد کی کچھ ضرورت نہیں۔

انگریزی زبان میں اس حقیقت کے اظہار کے لئے کئی ضرب الامثال ہیں "نیکی خود اپنا اجر ہے" "ہمّت مرداں مددِ خدا" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن دنیا پر ان ضرب الامثال کی دانشمندی جس عمدگی کے ساتھ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں

کے عمل میں ظاہر ہوئی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ایک انسان کی مثال سے متأثر ہو کر نیکی کے حصول کے لئے لاتعداد انسانوں کی بے غرضانہ کوشش کا نتیجہ دنیا میں ایک پُر مسرت تہذیب کا قیام تھا اور یہ تہذیب پُر مسرّت ہی رہی جب تک اس کوشش کو خیر باد نہ کہہ دیا گیا۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ؕ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۙ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ۠

ترجمہ۔ تو تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ ہاں تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ سو جب تو فارغ ہو تو کام میں لگ جا اور اپنے رب کی طرف دل لگا۔

زمانہ ما بعد کے مسلمانوں نے اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیا اور جب انہیں جنگ سے مہلت ملی اور بظاہر جد و جہد کی ضرورت نہ رہی وہ ڈھیلے پڑ گئے۔ تن آسانیوں میں ڈوب گئے اور اس طرح تہذیب اسلامی کی قوت مبدل بہ انحطاط ہو گئی اور اُس پر بتدریج وہ طویل زوال مسلّط ہوتا گیا جس میں وہ آج

تک مبتلا ہے ۔ اسلام کا سیدھا سادہ مگر پر زور ضبط و نظم جس کی ابتدا خود مسلمان کے نفس سے ہوتی ہے غیر مسلموں کے لئے جو اس امر کے تصور سے عاری ہیں کہ کیوں کوئی مرد یا عورت ایسے کام اپنے ذمے لے جن میں اُس کے لئے قطعاً کوئی مُسرّت یا منفعت نہیں اور جس کا اُسے حکم دیا جاتا ہے ۔ جہاد کے سلسلہ میں قابلِ فہم ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ یہ ایک بے غرضانہ جدوجہد ہے جس کے لئے ہر شخص کو ایک تربیت کی ضرورت ہے ۔ ہماری نمازیں ۔ ہمارے روزے ۔ ہمارا حج اس جذبہ جہاد کے بغیر محض رسوم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے ۔ مسلمان کے لئے ایمان کا اقرار ہی نہیں احکامِ شریعت کی متابعت بھی لازم ہے ۔ دوسرے مذاہب والوں سے تو محض اقرار و اعلان عقیدہ کا مطالبہ کیا گیا ہے ۔ اسلام اقرار عقیدہ ہی نہیں اُس پر عمل کا طالب ہے ۔ ذات باری کے وجود کا زبان سے اقرار اور عمل سے اُس کی عدم تصدیق فی الحقیقت ایک فرض کی ادائیگی سے عملاً انکار کا مرادف ہے اور اس طرح ثواب نہیں ایک عیب

ہے۔ اسلام میں معیار تو عمل ہے۔

عسکری تربیت کی ضرورت

ایک دوسرے مذہب کے مفکّرین نے فرمایا ہے کہ انسان پر خود اُس کی ذات سے متعلق کوئی فرائض عائد نہیں ہوتے۔ البتہ خدا اور ہمسائے سے متعلق اُس پر فرائض ضرور عائد ہوتے ہیں اور خود اُس کی ذات سے متعلق فرائض انہی دو فرائض میں ضم ہو جاتے ہیں اسلامی نظریہ اس سے مختلف ہے۔ شریعت اسلامی علی الاعلان پکارتی ہے کہ ہر انسان پہ خود اُس کی ذات سے متعلق ایک فرض عائد ہوتا ہے اور وہ ہے فریضۂ جہاد جس کے معنے نیکی کے قیام کے لئے بدی کا استیصال ہے جس کی ابتدا مسلمان کو خود اپنے نفس کی حرص و ہوا پر قابو پانے کے لئے جدوجہد کی صورت میں ہونی چاہیئے۔ ہر انسان کی ذات سے متعلق جو فرائض اُس پہ عائد ہوتے ہیں فریضۂ جہاد یعنی مقررہ مخصوص حالات میں مردانہ وار میدانِ جنگ میں کُود پڑنا بھی شامل ہے

خواہ زندگی بھر اُسے کبھی بھی کسی جنگ میں شمولیت کا موقع میسر نہ آئے۔ ایک طرف تو جہاد کے لئے اُس کی تربیت و آمادگی محض عسکری تربیت ہی نہیں بلکہ اسلامی ضبط و نظم کا مُرقع ہے دوسری طرف دیکھئے تو جنگ کے حکم کا لازمی نتیجہ مسلمانوں میں عالمگیر عسکری تربیت ہے جو ہر اسلامی مملکت میں از روئے قانون لازم و لابد ہونی چاہیئے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ایک تربیت یافتہ مجاہد ہو۔ تاکہ وہ جہادِ زندگی میں جو طاغوتی طاقتوں کے خلاف ہمیشہ اور ہر مقام پر۔ خود اُسی کے قلب و ضمیر میں۔ کارخانے میں۔ بازار میں۔ قانون ساز کونسلوں میں اور میدان جنگ میں بپا ہے شمولیت کر سکے۔ مسلمان کو اپنے دنیوی مقبوضات اور مال و منال میں کبھی بھی اس قدر پھنس نہیں جانا چاہیئے کہ جب اچانک اُسے اُس مال و متاع دنیوی سے محروم ہونا پڑے تو اُس کے لئے یہ ابتلا عظیم ثابت ہو۔ مسلمان کی زندگی اور حکم جہاد کا تقاضا ہے کہ جب اُس کے مقبوضات و مملوکات اس کا مال و منال یا اُس کی مطمئن و پُر امن

زندگی اور احکامِ الٰہی کی متابعت میں کوئی تصادم پیدا ہو تو اُسے دامن جھٹک کر ان سب سے منہ موڑ کر محض رضائے الٰہی کے لئے ہجرت پر تیار ہو جانا چاہیئے اور اُس مال و متاعِ دنیوی سے محرومی پر بھی اُسے سکونِ قلب اور اطمینانِ خاطر کی دولت سے مالا مال رہنا چاہیئے۔

زادِ آخرت

بہر صورت اس پنج روزہ حیاتِ مستعار کے بعد رحلت کی منزل ہر شخص کو پیش آنی ہے۔

ایں ہمہ ہیچ است چوں می بگذرد
تخت و بخت و امر و نہی و گیر و دار

انسان دُنیا سے اپنے ساتھ کیا لے جاتا ہے۔ کچھ نہیں۔ لیکن بلاشبہ کچھ چیزیں آخرت میں ضرور ہماری منتظر ہوں گی اور ہمارے عیب و ثواب کا فیصلہ انہی پر موقوف ہو گا۔

بہ الفاظ قرآن:۔ ما قدمت ایدینا (جو کچھ ہمارے

اپنے ہاتھوں سے ہم سے پہلا بھیجا ہے)

اور یہ اُن کوششوں کا ایک ریکارڈ ہوگا جو نیکی کی حمایت میں۔ زمین پہ خدا کی بادشاہت کے قیام کے سلسلہ میں۔ مفلسوں۔ ناتوانوں۔ جاہلوں اور مظلوموں کی امداد اور ظلم و زیادتی اور شر و فساد کے انسداد میں ہم سے معرض ظہور میں آئیں یعنی ہمارے "جہاد" کا ایک حساب۔ دولت دنیا ایک عطیہ ایزدی ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے اس سے محروم کر دیتا ہے۔ دولت ایک امانت ہے جو ہمارے لئے بعض اوقات ایک کڑی آزمائش اور اصولوں کو جانچنے کے لئے ایک عملی معیار کا کام دیتی ہے اور بعض حالات میں اس کا وجود ایک سزا و عذاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ روحانی نقطہ نگاہ سے تو یہ خطرناک "تکلیف" وہ اور عارضی عطیہ ہے۔ ہمارے لئے ثبات و دوام حاصل ہے تو صرف اسی وعدہ الٰہی کو اور قابل اعتماد ہے تو وہی ارشاد ربانی کہ "وہ لوگ جو ایمان لاتے اور نیکی اور تقوے کے حصول کی سعی کرتے

ہیں اور جو لوگ اپنے گھروں سے ہجرت کرتے ہیں اور اللہ کے راستے میں اپنے مال و منال سے دستبردار ہو جاتے ہیں "

فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

ترجمہ۔ تو اس کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور اُن کو کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اسلام اور تہذیب جدید

یہی اسلام کی تقدیر پرستی ہے لیکن یہ وہ تقدیر پرستی نہیں جس سے ہمیں عام طور پر متہم کیا جاتا ہے۔ یہ تو ایک سعی پیہم ایک جہد مسلسل اور بے پناہ حرکت و عمل کا نام ہے۔ فی الحقیقت جہاد ایک پُرعظمت اور پاکیزہ زندگی ہے جو ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہے۔

تہذیب جدید اور تہذیب اسلامی میں تطابق کی ضرورت

تہذیب جدید نے مسلمانوں کے قلوب و اذہان میں

ایک ابتری پیدا کر دی ہے۔ وہ اس تہذیب سے اس لئے گریزاں ہیں کہ وہ اسے قربانی و ایثار کے بجائے حرص و طمع اور سود خواری کا ایک مظہر سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس سے علیحدہ رہ کر اپنی راہِ نجات تلاش کریں۔ آج اکثر کاموں اور پیشوں کیلئے انہیں کوئی مذہبی جواز نظر نہیں آتا۔ تجارت آج ایک گلو تراش مقابلہ اور دروغ بافی کا کاروبار بن کر رہ گئی ہے۔ قانون محض حیلہ بن کر رہ گیا ہے۔ سائنس کو خود غرضی اور ہلاکت آفرینی کا آلہ بنا لیا گیا ہے الغرض قرآن حکیم کے الفاظ ہیں:-

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤی ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی ؕ

انسان باغی ہے اور وہ اپنے آپ کو آزاد و مختار سمجھتا ہے۔

لیکن مسلمانوں کے لئے زندگی کے میدان سے یوں کنارہ کشی کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ان نامساعد حالات کے خلاف میدانِ عمل میں سینہ سپر ہو جائیں کیونکہ اسلام کی غایت العایات

ہی انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی حلقہ بگوشی میں لے آتا ہے۔ جہاد کے تصور اور عمل اور مسائل حاضرہ میں تطابق پیدا کرنا وقت کی ضرورت ہے اور ایسا محض اسلامی ادارات وشعائر کے احیائے جدید ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

اگر موجودہ سوسائٹی کی بنا سود ہے تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ آج ایک ایسا معاشرہ قائم کر دکھائیں جس میں سود ناپید ہو۔ اگر قانون شریعت آج محض حیلہ سازی کا نام رہ گیا ہے تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ قانونِ شریعت کو دوبارہ استوار کریں اور کم از کم اپنے معاشرہ میں قانونِ شریعت ہی کی متابعت کو اپنے اُوپر لازم کرکے اُسے دین و دنیا کی کامرانیوں کا ذریعہ جانیں۔ اگر موجودہ نظام بینک کاری مسلمانوں کی نظر میں سود پر مبنی ہے تو ایک اسلامی نظام بینک کاری قائم کرنا چاہیئے جس کی بنیاد سود خواری نہیں اخوت ہو۔ انہیں زکوٰۃ اور بیت المال دوبارہ قائم کرنے چاہئیں۔ اگر موجودہ تجارتی طریقے مسلمانوں کے نزدیک مذموم ہیں تو انہیں اپنی تجارت امداد باہمی

کے اصول پر استوار کر لینی چاہیئے۔ اگر موجودہ صنعتی نظام اُن کی نظر میں ایک خود غرضانہ ظلم ہے تو انہیں چاہیئے قانونِ شریعت کی مطابقت میں ایک جداگانہ صنعتی نظام قائم کر دکھائیں۔ مسلمانوں کے لئے تہذیب جدید میں ضم ہو جانا خود کشی سے کم نہ ہوگا کیونکہ اس کے معنے تہذیب جدید کے تمام عیوب کو قبول کر لینا ہوں گے ایسا کر لینے کے بعد مسلمان کبھی بھی اس دنیا میں نیکی کے لئے ایک قوت یا سہارا ثابت نہ ہو سکیں گے۔ لیکن اُن کے لئے اس تہذیب سے اس کے علوم و فنون اور اس کی کارگذاری سے یکسر بیگانگی بھی خودکشی سے کچھ کم نہ ہوگی۔ مسلمان پدرم سلطان بُود، کے فسانوں اور ترانوں پر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ایسا کرنے سے وہ اسلام سے اسی طرح محروم رہ جائیں گے جس طرح ایک غیر اسلامی تہذیب کو کلیتہً اپنا لینے سے۔ عہد حاضر کے مسلمانوں کے لئے تعلیم جدید کا اس غرض سے حاصل کرنا کہ وہ عصر جدید کے عیب و ثواب سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں اُن

کے لئے جہاد الاکبر کا مرتبہ رکھتا ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ ہر اچھائی کو پہچانیں اور اپنا لیں اور ہر برائی کے استیصال کے لئے کمربستہ رہیں تاکہ کوئی بہتر چیز اس کی جگہ مناسب وقت پر نافذ کی جا سکے دنیا آج ہلاکت کے گڑھے پر کھڑی ہے اور مسلمان ہی اسے بچا سکتے ہیں کیونکہ تہذیب کا معیار صرف اُن ہی کے پاس ہے اور صرف وہی ایک متبادل کامل نظام تہذیب قائم کر کے دکھا سکتے ہیں اور وہ ایک ایسا نظام ہے جس کے لئے اُن کے پاس خدائی سند موجود ہے اور وہ نظام ایک محیر العقول کامیابی کے ساتھ گذشتہ زمانے میں زیرِ عمل رہ چکا ہے۔ اسلامی نظام ہی وہ نظام ہے جو ہر عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور مستقبل میں کامرانی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ یورپ کے انقلابی نظامات کے متعلق جو زیر عمل رہ چکے ہیں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تمام نظامات انسانی مسرتوں میں ذرہ برابر اضافہ کرنے سے قاصر رہے ہیں ہمیں یہ امر خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے

کہ دوسری اقوام کے خلاف اپنی ملّت کی کامرانی وکامیابی کی کوشش بلا لحاظ اس امر کے ہم راہِ صواب پر ہیں یا جادہ ناصواب پر جہاد نہیں کہلا سکتی۔ جہاد تو حق کی خاطر باطل کے خلاف جہاں کہیں اور جس صورت میں اس کا موقعہ پیدا ہو ایک جنگ ہے اگر آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جہاد کے اس تخیّل کا سُراغ تاریخ اسلام میں نہیں ملتا تو خدا آپ کو راہ راست نصیب کرے۔ خلفائے بنی اُمیّہ اور بنی عباس نے مشرق کی رومن سلطنت سے جو معاملات کئے اُن کا مطالعہ فرمائیے ہسپانیہ کے اُمیّہ خلفاءُ نے مغرب کی مسیحی سلطنت سے جو سلوک روا رکھا اُس کا تذکرہ پڑھیئے تو آپ پر روشن ہو جائے گا کہ اُن کا نصب العین باطل کے خلاف حق کی حمایت کا ہی جذبہ تھا۔ سلطان سلیماں کا خط فرانسس شاہ فرانس کے نام دیکھئے جو اُس وقت لکھا گیا جب وہ ایک قیدی تھا اور اپنی تمام دولت سے بے جا طور پر محروم کر دیا گیا تھا تو آپ کہ یہ اصول اور اُس کی حمایت

میں سعیِ پیہم کی درخشاں مثالیں نظر آئیں گی۔ مسلمان کا منشا
اس دنیا میں اپنی نہیں خدا کی بادشاہت اور شریعت
کی فرمانروائی کا استوار کرنا ہے۔ شریعت اسلامیہ کی
بنا ایسے قوانینِ فطرت ہیں جو تمام بنی نوعِ انسان
کے لیے ہیں اور جن کی عالمگیری مسلّم ہے۔ کسی ادنٰے
اور پست مقصد کے لئے اُن کا استعمال اُن کی غلط
توجیہہ ہی نہیں ہلاکت اور نامرادی کا راستہ ہے۔ بنی نوعِ
انسان کی بہتری و برتری سے وسیع تر منشا کی عدم موجودگی
میں کوئی سعی جہاد کے مرتبہ رفیع کو پہنچنے کی حقدار نہیں۔
مسلمان کی تقدیر پرستی جس کے متعلق اس قدر ہنگامہ
بپا کیا جاتا ہے ایک ایسی ناگزیر حالت یا کیفیت
ہے جس کا اعتراف خواہی نخواہی کرنا ہی پڑتا ہے۔
ہمیں پوری خندہ پیشانی سے اس امر کا اعتراف کر
لینا چاہیئے کہ ہماری موجودہ حالت منشا ربانی کے ماتحت
ہم پر مسلّط کر دی گئی ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے
کہ مسلمان کا جہاد ہمیشہ کی طرح اب بھی بدی کے خلاف
نیکی کے لئے ایک جد و جہد کی صورت میں جاری

رہنا چاہیئے - ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پہلے تو ہم اسلامی برادری کی بنیادیں عہدِ حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئے سرے سے استوار کریں - اس کے بعد مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ اپنے نیک اعمال سے دُنیا کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا احساس بیدار کریں ۔

خطبۂ ہفتم

اسلام میں عورت کی حیثیت

مجھے آج اسلام میں عورت کی حیثیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے موضوع کی نزاکت کا پورا پورا احساس ہے میرے لئے یہ موضوع نازک ہی نہیں حد درجہ الم انگیز بھی ہے کیونکہ اس سے بحث کرتے ہوئے مجھے قدم قدم پر یہ احساس دامنگیر ہوتا ہے کہ میں اُس ملک میں ہوں جہاں عورت کو یقیناً اپنے اسلامی مرتبے سے محروم رکھا گیا ہے اور جہاں مرد بالعموم آن مظالم سے جو عورت

پر روا رکھے جاتے ہیں بے اعتنائی کے مجرم ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان عورتوں کی اکثریت جس ذلت میں مبتلا ہو چکی ہے وہ اسلام کی سراسر توہین ہی نہیں ایک جرم بھی ہے جس کی پاداش مسلمانوں کو معاشرتی پستی۔ کمزور و بیمار بچوں۔ کثرت اموات اطفال کی صورت میں اُس وقت تک بھگتنی پڑے گی جب تک وہ اس جرم کے ارتکاب سے باز نہیں آتے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کا آغاز مسلمانوں کی اکثریت کی طرف سے غیر شعوری طور پر نادانی اور جھوٹی شیخی کی غیر اسلامی روایات کے اختیار کرنے سے ہوا۔ لیکن قانون سے بے خبری کسی شخص کو اُس کی خلاف ورزی کے عواقب و نتائج سے بچا نہیں سکتی۔ قوانین فطرت کی خلاف ورزی کی تعزیرات سے تو بالخصوص کوئی شخص ناواقفیت کے عذر کی بنا پر بچ نہیں سکتا۔ شریعتِ اسلامیہ کے قوانین حقیقت میں قوانین فطرت ہیں اور اُن کی خلاف ورزی کے عواقب و نتائج سے مسلم و غیر مسلم کسی کے لئے مفر نہیں۔ وہ

احمق جو یہ نہیں جانتا کہ آگ جلاتی ہے ؎
چوں یکدم اندر آں افتد بسوزد
آگ اس کی عدم واقفیت یا نادانی کی بنا پر اپنے فطری فعل سے کیونکر باز رہ سکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کی طرف سے شریعت سے عدم واقفیت کا عذر تو عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے۔ کیونکہ بنی آدم میں سے اُن پر ہی یہ فرض خاص طور پر عائد کیا گیا ہے کہ وہ علم حاصل کریں اور بنی نوع انسان میں اس علم کی اشاعت ہی اُن کا خاص مقام و مقصد قرار دیا گیا ہے۔

از برائے خدا میری زبان سے ہندوستان میں مسلمان عورت کی موجودہ دردناک حالت کی مذمت سن کر یہ خیال نہ فرمایئے کہ میں ہندوستان کی مسلمان عورتوں کی حالت کا اندازہ غیر اسلامی معیار سے کر رہا ہوں یا غیر اسلامی طریقوں کے اختیار کرنے کی تلقین کر رہا ہوں۔ میرا معیار اسلامی ہے اور میں اسلامی طریق ہی کے اختیار کرنے کا حامی ہوں۔ میں تو مشرق و

مغرب دونوں میں عورت کی حیثیت کو صرف اسی معیار اسلامی پر جانچتا ہوں جیساکہ ہر عہد کے تمام روشن خیال مسلمانوں کی تقلید میں میں اسے سمجھتا ہوں۔

وکذٰلك جعلنٰكم امّۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا ط

ترجمہ:- اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پہ گواہ ہو اور رسولؐ تم پہ گواہ بنیں۔

یقیناً رسولؐ اللہ آج عورتوں کی حیثیت سے متعلق تمہارے خلاف شاہد ہیں ذرا اُن کے ارشاد کی طرف توجہ دیجئے :۔

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ

علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کا ایک مقدس فریضہ ہے۔

میں جانتا ہوں کہ آپ میں کے ایک ذی اثر گروہ کی یہ قطعی رائے ہے کہ 'علم' سے مراد یہاں محض

علم دین، ہے۔ قرآنِ کریم اور رسول اکرمؐ نے دینی اور دنیوی علم میں کبھی کوئی امتیاز روا نہ رکھا تھا۔ ایک سچے مسلمان کے لئے تمام زندگی، مذہبی ہے اور تمام علم سراپا مذہب ہی ہے۔ اسلام کی صحیح تعلیم کے مطابق مذہبی حقائق کی تشریح و وضاحت کا حق اُسے پہنچتا ہے جو اپنے علم اور زندگی کے تجربے کی بنا پر ایک امتیاز رکھتا ہو اور وہی مسلمانوں کے مذہبی مسائل کا کامل حل پیش کرنے کا اہل گردانا جاتا ہے۔ میں محدود علم و نظر کے لوگوں کے اس مخصوص تشریح و تفسیر کے حق سے انکار کرتا ہوں۔ میں ان کے پیش کردہ نتائج کو اسی طرح ناقابل قبول سمجھتا ہوں جس طرح اُن کے وہ مفروضات میرے نزدیک ناقابلِ تسلیم ہیں جن پر وہ نتائج مبنی ہیں۔ میری رائے میں ایسے علماء کی ایسی تفسیر و تاویل کے حق کا تسلیم کر لینا رسولِ خدا اور مسلمانوں کے درمیان ایک مُلّایانہ مداخلت ہے۔

وسلے تاویل شاں درحیرت انداخت
خدا و جبریل و مصطفےٰ را رمز

قرآنِ کریم نے بارہا اس کی مذمت کی ہے۔ اور ازمنہ گذشتہ میں مذہب حقہ کو اسی بنا پر نقصان پہنچا ہے لیکن میں ایسے علمائے کے اس مخصوص تفسیر و تاویل کے حق کو تھوڑی دیر کے لئے مانے لیتا ہوں آیئے بحث کی خاطر ہم تسلیم کر لیں کہ 'علم' سے مراد محض وہی علم ہے جو ان بزرگوں کا طرۂ دستار ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے!

کیا ہندوستان میں ہر مسلمہ کو ایسا علم حاصل کرنے کی ترغیب تو بڑی بات ہے اجازت بھی دی جاتی ہے؟

کیا ہندوستان میں ہر مسلمہ کو اس نوعیت کی تعلیم میسر ہے؟

کیا ہندوستان میں ہر مسلمہ کو سورہ فاتحہ تو درکنار کلمہ بھی یاد ہے؟

کیا ہندوستان میں ہر مسلمہ کو نماز پڑھنا آتی ہے؟

ہندوستان میں کتنی مسلمان عورتوں کو اُن آیات و احادیث سے واقفیت حاصل ہے جن پر اسلامی برادری میں مسلمان عورت کی حیثیت موقوف ہے؟ خدا لا اُن سب کو ایسی ہی تعلیم سے بہرہ ور کیجئے۔ میں ابتداً اس سے زیادہ کا طالب نہیں باقی سب کچھ اپنے آپ ہو رہے گا۔

پیغمبرؐ اسلام کا ارشاد ہے :-

"عورتیں مردوں کا جڑواں نصف ہیں"

"عورتوں کے حقوق مقدس ہیں"۔ "خبردار عورتوں کو اُن کے وہ حقوق حاصل رہیں جو اللہ نے انہیں عطا کر رکھے ہیں" کیا ہندوستان میں عورتوں کو اپنے اسلامی حقوق کا علم تک بھی ہے شریعت اسلامی میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ قانونی مساوات حاصل ہے۔ عورتوں کو جداگانہ حق ملکیت سے بہرہ ور کیا گیا ہے۔ اور خاص حالات میں انہیں حق خُلع یعنی طلاق حاصل کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں آج کتنی عورتیں اپنے اس شرعی حق سے واقف ہیں اور ہندوستان

میں آج اُن کے لئے اس امر کا کون ضامن ہے کہ اُن کے حقوق شرعی اُن کے لئے استوار و حاصل ہیں بلا شبہ ہندوستان میں مسلمان عورتوں کے حقوق شرعی کا آج کوئی محافظ نہیں۔ ہندوستان میں اُس قاضیہ کا وجود ڈھونڈھے سے نظر نہیں آتا جو امام اعظم ابو حنیفہ کی رائے میں ہر شہر میں موجود ہونی چاہیئے تاکہ عورتوں کے حقوق سے متعلق مقدمات کا فیصلہ کر سکے۔ وہ قاضی کہاں ہے جس کے پاس عورتیں داد خواہی کے لئے اپنی فریاد براہِ راست لے جا سکیں۔ قاضی تو عورتوں کے حقوق کا نگران و محافظ ہوا کرتا تھا۔ ہندوستان میں آج قاضی کی حالت اُس کے مذہبی مرتبہ سے اُسی قدر گری ہوئی ہے جس قدر مسلمان عورت کی حیثیت اُس کے معیار اسلامی سے فروتر ہے اور دونوں کی موجودہ حالتوں کے لئے کوئی وجہ جواز نظر نہیں آتی۔

مرد و عورت کو شریعت نے مساوی حقوق عطا کئے ہیں اور قرآنِ کریم پکار پکار کر کہتا ہے کہ اللہ کی نظر میں مرد و عورت برابر ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:-

مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۔

ترجمہ:- جو عمل نیک کرے خواہ مرد ہو خواہ عورت۔

عرب جاہلیت میں عورت کو ایک جداگانہ فرومایہ مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ قرآن ایسے لوگوں کو یاد دلاتا ہے کہ وہ ایک ہی نسل سے ہیں اور ایک دوسرے سے یعنی عورت مرد سے اور مرد عورت سے پیدا ہوتا ہے ۔

پردہ

قرآن کریم اور احادیث نبوی سے اس امر کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا کہ عورتوں کو روشنی، تازہ ہوا یا مفید صحت مشاغل یعنی اُن نعمتوں سے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے صدقے میں بنی نوع انسان کے لئے عام کر دی ہیں محروم کیا جا سکتا ہے شریعت

میں عورت کے لئے اس حبس دوام کی سزا کا بھی
کوئی جواز نہیں جس کی بدولت ہر سال ہزاروں عورتیں
تپ دق اور قلت خون کا شکار ہو جاتی ہیں اور
خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان پابندیوں کی وجہ سے
کتنے بچے ہر سال موت کی نیند سو جاتے ہیں۔ قرآن
شرم و حیا اور عفت و شرافت کا حکم ضرور دیتا ہے
لیکن قرآن و حدیث میں تو کہیں ان مروجہ پابندیوں
جواز نظر نہیں آتا۔

خالص عربی اور اسلامی روایات سر اور گردن
ڈھانپنے اور شرم و حیا کی تاکید کرتی ہیں۔ چہرے
نقاب سے چھپانا اصلاً اسلامی رواج نہ تھا۔ ظہور اسلام
سے قبل اس قسم کے پردے کا رواج عرب کے شہروں
میں نہیں البتہ ایشیا کے بہت سے شہروں میں تھا۔
ہندوستان کا سا مروجہ پردہ ابتدائی کئی صدیوں تک
مسلمانوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ مسلمانوں نے
چہرے کا پردہ اور بعض دوسرے رواج اس وقت
اختیار کئے جب وہ شام۔ عراق۔ ایران اور مصر

شہروں میں پہنچے اس قسم کا پردہ اُن ممالک میں پہنچ کر
کچھ تو اُن ممالک کے رواج کے پیشِ نظر اختیار کیا گیا
اور کچھ اپنی عورتوں کو اُن ممالک کے باشندوں کی
بدگمانیوں سے بچانے کے لئے جن کے نزدیک چہرے
کی نمائش بد اطواری کی علامت متصوّر ہوتی تھی بعد میں
عرب کے شہروں میں بھی اس پردے کو تمدّن کی علامت
سمجھ کر اختیار کر لیا گیا۔ تمدّن کو انگریزی میں تہذیب
کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے لیکن عربی میں تمدّن میں شہری
زندگی کا مفہوم غالب ہے۔

اس نوعیت کے پردے کا رواج مسلمان عورتوں میں
کبھی بھی عالمگیر نہیں ہوا اور اُن کی اکثریت نے اُسے کبھی
اختیار نہیں کیا۔ کیونکہ دُنیا میں مسلمان عورتوں کی اکثریت
دیہات میں رہتی اور اپنے باپوں۔ بھائیوں اور خاوندوں
کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی ہے اُن کے لئے نقاب
تو ایک احمقانہ مصیبت ہوتی۔ چادر شف البتہ عالمگیر ہے
مصری۔ شامی۔ ترکی یا عربی دیہاتی عورتیں نقاب صرف
اُس وقت ڈالتی تھیں، جب وہ شہر کو جاتی تھیں اور وہ

بھی گویا کانا پردہ ہی ہوا کرتا تھا۔ برخلاف اس کے جب شہری عورتیں مضافات میں جاتیں وہ چہرے کا نقاب اور اُس کے ساتھ تمام وہ آداب و طریقے ترک کر دیتیں جن کی پابندی شہروں میں اُن پر لازم ہوتی۔ مجھے ہندوستان کے سوائے کسی دوسرے ایسے ملک کا علم نہیں جس میں وہ طریقے جو شہروں کے بسنے والے دولتمند لوگوں نے ایک زمانے میں بطور حفاظت و امتیاز اختیار کئے تھے (اور ایسے لوگوں کے پاس باغات اور کشادہ محلات موجود تھے) غریبوں نے اختیار کر رکھے ہوں جن کی کال کوٹھڑیوں میں عورتوں کا بند کر دینا محض ظلم ہے لطف تو یہ ہے کہ دولتمند مسلمانوں نے بھی تو ہر جگہ ان طریقوں کو اختیار نہیں کیا تھا۔ عمارہ مشہور مورخ نے ہمیں بتایا ہے کہ یمن کے عربوں میں پانچویں صدی ہجری میں بڑے بڑے خود مختار سرداروں نے اپنے گھرانوں کی عورتوں کا بلا پردہ پھرنا اپنے لئے وجہ عزو افتخار سمجھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس قدر طاقتور اور بلند سمجھتے تھے کہ اُن کی عورتوں کو کوئی میلی نظر سے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

اس قدر البتہ سچ ہے کہ اس خاندان نے جو زبید میں حکمرانی کرتا اور یمن میں خلافت بنی العباس کا نمائندہ تھا دربار بغداد کی عجمیت کی تقلید میں حرم کا طریق اختیار کیا۔ پس پردے کا طریق اپنی ابتدا کے اعتبار سے نہ عربی ہے نہ اسلامی - اس کی ابتدا زردشتی عجمی اور مسیحی بیزنطینی ہے۔ اسلام سے اس مروجہ پردے کا کچھ تعلق نہیں اور نہ ہی مسلمان عورتوں کی اکثریت نے ایسا پردہ کبھی اختیار کیا ہے۔ جب تک پردے کا رواج بڑے بڑے خاندانوں کی عورتوں تک محدود تھا جنہیں ورزش اور سیر و تفریح کے لئے وسیع محلات میں کافی جگہ میسر تھی پردہ عورتوں کے لئے نہ ضرر رساں تھا نہ اُن پر ظلم و زیادتی کا موجب گردانا جا سکتا تھا اور اُسے ایک خاص عہد کا رواج سمجھتے ہوئے اسلامی نقطہ نگاہ سے ناقابلِ اعتراض قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جونہی پردہ عورتوں کے لئے باعثِ اذیت و ضرر ثابت ہوا شرعی نقطہ نگاہ سے جو عورتوں سے مروت و حسن سلوک کا مقتضی اور اُن کی برتری اور ترقی کا متمنی ہے کھلے طور پر

قابل اعتراض قرار پایا۔ اسلامی معاشرے کا ہر طبقہ کبھی پردے کا مکلف نہیں ہوا ہندوستان کی طرح جونہی تمام طبقے اس کی زد میں آجائیں یہ ایک شر اور فساد بن جاتا ہے جس کی شریعت کبھی روا دار نہیں ہو سکتی۔

ہندوستان میں عورتوں کی موجودہ حالت سے مقابلہ کیا جائے تو ترکی، شام، مصر اور عرب میں عورتوں کو ہمیشہ آزادی حاصل رہی ہے۔ مثلاً ان ممالک میں متوسط طبقہ کی شہروں میں رہنے والی عورتیں نقاب اوڑھے ہمیشہ بازار سے سودا سلف خریدنے اور دوسری عورتوں کے پاس ملاقات کے لئے آنے جانے کے لئے، آزاد تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ پردے کے پیچھے عورتوں کی دنیا مردوں کی دنیا کی طرح آزاد و دلچسپ رہی ہے فرق صرف اس قدر رہا ہے کہ وہ دنیا مردوں سے علیحدہ اور آزاد رہی ہے۔ عورتیں نقاب ڈالے گلیوں میں ہر طرح مصئون و مامون تھیں۔ اُن میں سے کسی کی توہین تمام مسلم آبادی کو درپے انتقام کر دیتی تھی۔ متوسط الحال خاندانوں کی عورتیں اپنی مرضی سے ہر جگہ آجا سکتی تھیں

اور انہیں آپس میں مل بیٹھنے کے مواقع کثرت سے میسر تھے۔ مختلف اسلامی ممالک میں مسلمان عورتوں کو جو آزادی میسر آئی ہے وہ قانون شریعت کے بجائے نسلی افتاد مزاج اور مقامی روایات پر موقوف رہی ہے۔ قانون شریعت تو عورتوں کے بعض حقوق کا ضامن ہے اور اس امر کا مقتضی ہے کہ عورتوں سے حسنِ سلوک روا رکھا جائے اور اُن کے حقوق کی تقدیس کا اعتراف کیا جائے اور اُن کے حق میں اسلامی قانون سے زیادہ منصفانہ قانون سے دنیا ناآشنا ہے۔ عربوں اور ترکوں میں اس اعتبار سے ایک امتیاز تھا۔ کیونکہ ترکوں نے زیادہ تر بیزنطینی رسوم اختیار کر لی تھیں لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا اس کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان عورتوں کی اکثریت جس حالت و حیثیت میں زندگی بسر کر رہی ہے ترکوں اور عربوں میں سے کسی قوم میں بھی عورت اُسے قبول نہ کرتی اور نہ ہی ان ملکوں میں مرد عورت کی ایسی حیثیت کو روا رکھتے یا قبول کرتے۔

پرانے زمانے میں ترکی عورتوں کی جو حالت تھی وہ عہد جدید میں سقاکی بن چکی تھی۔ اس کا سبب اس قدر دلغریب ہے کہ میں اس کے بیان کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ جب ترک پہلے پہلے اناطولیہ اور رومیلیہ میں آئے تو وہ وسط ایشیا کی ایک سانولی رنگت والی قوم تھے۔ اُن کی داڑھیاں چھدری اور آنکھیں ترچھی تھیں اور اس اہلیت کی تصدیق آج بھی اُن کے سلاطین اور اُن کے جرنیلوں کی تصاویر سے ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی آبادی ولایت ادانہ کے دہقانوں میں آج بھی نظر آ سکتی ہے لیکن کسی دوسری جگہ اُن کا سُراغ کہیں مشکل سے ہی ملے گا۔

سرکیشیا۔ جارجیہ۔ البانیہ۔ شام۔ بلغاریہ۔ سرویہ اور ایشیا و یورپ کی دوسری سفید فام اور خوبصورت قوموں سے ازدواجی تعلقات کی بدولت ترک آج اس قدر گورے ہیں جس قدر انگریز۔ یہ تغیر ترک عورتوں کی شرح اموات میں اندوہناک اضافے کا موجب ہوا اور تبدیق نے تو بالخصوص وہ وہ ستم ڈھائے کہ الامان۔ جب تک

ترک عورت سانولے رنگ کی تھی۔ روائتی خانم آفندی کی تن آسانی اور آرام طلبی اُس کی زندگی کے لئے باعث مضرت نہ تھی۔ لیکن جب اُس کی رنگت میں سفیدی آ گئی تو پردے میں رہنے کے مضر اثرات نمایاں ہونے شروع ہو گئے اگرچہ ترک عورتوں کے پردے میں ہندوستانی پردے کی سی شدت نہ تھی لیکن چونکہ یہ ایک قسم کا پردہ ضرور تھا اس کی مضرت نمایاں ہو گئی۔ ترک ڈاکٹروں نے تحقیق و تجسس کے بعد یہ معلوم کیا کہ سفید فام عورتیں سانولی رنگت والیوں سے جسمانی طور پر کمزور ہوتی ہیں اور انہیں مقابلتاً ورزش اور تازہ ہوا کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے جب ترکی کے فرمانرواؤں پر اس انکشاف کی حقیقت و اہمیت پورے طور پر واضح ہو گئی تو وہ عورتوں کی آزادی کے حامی بن گئے۔ اور اپنی نسل کے بے پناہ روائتی جوشِ عمل کے ساتھ انہوں نے اوّلیں فرصت میں نقاب اور دوسری مضرِ صحت پابندیاں یکسر اڑا دیں۔

ترکی شہری عورت اب اس قسم کا لباس پہنتی ہے

جو اس نے ہمیشہ دیہات میں پہنا ہے یعنی خوب کسا ہوا باش ار تو (دوپٹہ یا سر کا صافہ) جس کے ساتھ ایک زیادہ لمبا اور زیادہ ڈھیلا دوپٹہ ہوتا ہے اور ایک لمبا ڈھیلا ڈھالا چغہ جو اُسے سر سے پاؤں تک ڈھانپے رہتا ہے ۔ اس لباس میں ایک تو عشوہ نمائی بھی کم ہوتی ہے اور دوسرے یہ پہلے چارشف اور نقاب سے زیادہ صحت بخش ہے آج ترک عورتوں کے لئے ورزش اور کھلی ہوا میں کھیلنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور اس مقصد کے لئے کلبیں قائم کی گئی ہیں۔ وہ مردوں کے برابر مگر اُن سے علیحدہ رہ کر تعلیم حاصل کر رہی ہیں ۔ ترک عورتیں آج ایسے ایسے کاموں میں مشاقی حاصل کر رہی ہیں جو اُن کی بڑدادیوں کے لئے سینکڑوں ندامتوں اور ہزاروں شرمساریوں کا باعث ہوتے۔ لیکن یہ سب حدود شریعت ہی کے اندر ہے بدلے ہوئے حالات نے عورت کے آزادانہ مشاغل کے حلقے کو وسیع تر بنا کر ان اعمال کو عورتوں کی صحت اور مسرّت کے لئے لازم و لابد بنا دیا ہے لیکن یہ تغیّرات ترکی عورتوں

کے لئے کچھ انقلاب انگیز نہیں ہیں کیونکہ اُن کے پیشِ نظر ہمیشہ دیہاتی ترکی عورتوں کی مثال موجود تھی جس کی بدولت وہ شہروں کے لباس اور بندشوں کو قانون شریعت سے متصادم ہونے سے بچا سکیں۔

ترکی کے دیہاتی بلاشبہ نہایت اچھے مسلمان ہیں اناطولیہ کے دیہات میں اسلامی ضابطۂ شائستگی پر لاجواب عمدگی سے عمل ہوتا ہے لیکن عورتوں کو ٹرکی۔ شام۔ سرکیشیا۔ مصر اور عرب کے دیہات اور بدوی اور دوسرے خانہ بدوش قبائل میں اتنی آزادی میسر ہے جو ایک ہندوستانی ملاّ پر سکتہ طاری کر دینے کے لئے کافی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی کمبختی یہ ہے کہ اُن میں کاشتکاروں کی کمی ہے۔ وہ اس ملک میں فاتحین کی حیثیت سے وارد ہوئے۔ اُن کے خیالات۔ اُن کی اُمنگیں اور اُن کے حوصلے وہی تھے جو اس زمانے میں افغانستان۔ ایران اور ترکستان کے امراء اور فرمانرواؤں کے سر میں سمائے ہوئے اور سینوں میں موجزن تھے۔ لیکن اب ہر ہندی مسلمان ضروری سمجھتا

ہے کہ اپنی عزت کے زعم باطل میں اپنی عورتوں سے
وہی لئیمانہ سلوک روا رکھے جو اصلی بیگ یا خان صاحب
سے اُسے ورثہ میں ملا ہے اُسے اس کی کیا پرواہ ہے
کہ اُس کی عورت کو ایک کال کوٹھڑی میں زندگی بسر
کرنا پڑتی ہے لیکن عورت سے سلوک کے معاملہ میں
وہ اُن مغل شہنشاہوں کی ریس ضرور کرنا چاہتا ہے جن
کی عورتوں کو قلعہ آگرہ کے پر شکوہ اور کشادہ زنانہ
محلّات میسّر تھے۔

ہندی مسلمانوں کو مزارعین کی عدم موجودگی ہی نے
پرانے زمانے کے شہری امرا میں مروجہ پردے کو
اسلامی قانون کا مظہر سمجھنے پر راغب کر دیا۔ اگر ہندوستان
میں بھی اس قسم کے مسلم مزارعین کا ایک طبقہ موجود
ہوتا جیسا کہ عرب۔ مصر۔ شام یا اناطولیہ میں موجود ہے
اور ایک گونہ قوم کی بنیاد کا کام دیتا ہے تو ہندی
مسلمان اس غلطی میں کبھی مبتلا نہ ہوتے کہ پردہ اُن غربا
کے لئے بھی ضروری ہے جو جھونپڑوں تو کیا دڑبوں
میں رہتے ہیں اور نہ ہی امیر ایسے پردے کو شہروں

اور گاؤں میں مساوی طور پر اختیار کرتے۔ کاشتکار ہمیشہ عقل سلیم سے بہرہ ور اور ہر قسم کے تصنع سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ اُن کے ہاں غلط معیار کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ کاشتکار مرد و عورت دونوں کو اُن کی مہارت اور کارگزاری اور انتظامی قابلیت سے جانچتا ہے۔ میں نے مصر کے ایک گاؤں میں ایک عورت کو انتظام و انصرام کا ذمہ دار پایا۔ اس عورت میں کردار کی بلندی کے ساتھ فراست اور معاملہ فہمی موجود تھی اور یہ کوئی نادر مثال نہیں۔ مصری فلاحین پُر جوش مسلمان ہیں اور اسلامی قواعد کی خاصی شدت سے پابندی کرتے ہیں۔

عورت کی حیثیت سے متعلق اسلامی قوانین عورت ہی کے فائدے کے لئے ہیں۔ اُسی ہی کی صحت و مسرت اُن کا منشا اور اُسی کی معاشی و معاشرتی بہتری اُن کا مقصود ہے اور وہ جامد و ساکت نہیں قوت و حرکت سے معمور ہیں وہ حالات میں تغیر کے ساتھ ساتھ معقول تغیر و تطابق کے حامی ہیں وہ کسی صورت میں

کسی ایسے رواج کی حمایت نہیں کر سکتے جو عورت کے
حق میں ناانصافی یا اُس کے لئے ایذا کا باعث ہو۔
پردے کا طریق اسلامی قانون کا جزو نہیں۔ یہ تو ایک
ایسا درباری رواج ہے جو اُس زمانے میں اختیار کیا
گیا جب خلافت عجمی اور بازنطینی اثرات کے ماتحت
اصلی اسلامی معیار سے گر کر محض ایک ایشیائی ملوکیت
بن کر رہ گئی تھی۔ پردہ مسلمانوں میں اُن رواجوں میں
سے ہے جو اُن کے لئے وجہ قوّت نہیں باعثِ کمزوری
تھے اسلام کی قوّت و احیا کا سرچشمہ ہمیشہ کسان کا
کھیت۔ لوہار کی بھٹی۔ گڈریئے کا جھونپڑا اور خانہ بدوش
چرواہے کا تنبو رہا ہے۔ انہی سرچشموں سے درباروں
کو نئی قوّت حاصل ہوئی ہے۔ مسلمانوں کو پردہ سسٹم
کے دلدادگان سے تو کوئی قوت و عزت حاصل نہیں
ہوئی۔ ہمارے لئے یہ بہتر اور ضروری ہے کہ ایک
عظمت گم گشتہ کا یہ نشان ختم ہو جائے۔ اگر ہندوستان
کے مسلمان غریب ہیں اور انہیں پیٹ پالنے تن ڈھانکنے
اور سر چھپانے کے لئے مشقت اختیار کرنی ہے تو انہیں

کاشتکاری کو ذریعہ معاش اختیار کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ زراعت اسلام کے نزدیک ایک محترم پیشہ ہے۔
حقیقت میں کوئی ملک جس میں کاشتکار غیر مسلم ہوں اسلامی کہلانے کا حق دار نہیں جہاں کہیں مسلمان اس طرح آباد ہیں کہ اُن میں کاشتکاروں کا وجود نہیں تو اُن کی زندگی اُس پھول کی سی ہے جو ایسے پودے میں نمودار ہو جس کی جڑیں نابود ہوں اور وہ زمین سے تازگی اور قوت حاصل کرنے سے محروم ہو۔
میں کوئی بہت بڑا اور فوری تغیّر نہیں چاہتا۔ نبی کریمؐ کے صاف صاف ارشاد کی متابعت میں عورتوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیجئے اور زمانہ حال کے تقاضوں کے ماتحت آپ خود دیکھ لیں گے کہ ہمارا مروجہ طریقِ پردہ ختم ہو جائے گا۔ مردوں اور عورتوں کے لئے حجاب و حیا کے اسلامی اصولوں سے اسے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر آپ مردوں اور عورتوں کو خالص اسلامی تعلیم سے بہرہ ور کریں گے تو اسلامی

قواعد اس تغیرِ حال سے نہ صرف متزلزل نہیں ہونگے بلکہ مزید قوت و ثبات حاصل کریں گے۔

شریعت عورت کے لئے سراپا سرمایہ رحمت ہے۔ اُن کی تعلیم و ترقی کی حامی ہے لیکن وہ اُن سے اس امر کی خواہاں نہیں کہ وہ مردوں میں گھل مل کے رہ جائیں۔ ڈاکٹر ہیری کیمبل نے لنڈن انسٹیٹیوٹ آف ہائیجین میں کچھ عرصہ گذارا کیا تھا:۔

" عورتوں کے پھیپھڑے مردوں سے چھوٹے ہوتے ہیں اُن میں خون کے ریکیے کمتر ہوتے ہیں۔ اُن میں زندگی کی آگ مردوں کی سی تیزی سے نہیں سُلگتی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتیں مردوں کی سی پُرمشقت زندگی بسر کرنے کی جسمانی طور پر نا اہل ہیں۔ عورتیں احساس میں مردوں سے مختلف ہیں لیکن دماغی صلاحیت کے اعتبار سے دونوں قریب قریب ایک ہی سطح پر ہیں۔ مردوں میں جہاں فطانت زیادہ ہے وہاں حماقت بھی زیادہ ہے۔" عورتوں اور مردوں میں جس طرح دماغی اور روحانی مساوات اور جسمانی تفاوت ہے

ٹھیک اُسی طرح اسلامی قانون اُسے تسلیم کرتا ہے۔ شریعت میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو اسلام میں عورت کے مرتبے سے متعلق عیسائیت میں مدتوں سے پھیلے ہوئے غلط خیالات کی تائید کرتی ہو۔ غیر مسلم کہتے ہیں کہ مسلمان عورتوں سے جانوروں کا سا سلوک روا رکھتے ہیں اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ عورت ایک بلا روح مخلوق ہے۔ لیکن اس غلط فہمی کا حقیقی سبب تو خود ہمارا جیسا کہ ہندوستان میں دیکھا جا سکتا ہے بلند اسلامی معیار سے گر جانا ہے۔

بلاشبہ یہ سچ ہے کہ عورت سے متعلق مغربی نظریہ اور مسئلہ زن و شو بعض اعتبارات سے اسلامی نقطۂ نظر سے یکسر مختلف ہے لیکن اس اختلاف کی نوعیت اگر ایک طرف ایسی نہیں ہے جیسی یورپین اسے قرار دے رہے ہیں تو دوسری طرف یقیناً ایسی بھی نہیں ہے جیسی اکثر مسلمانوں کے عمل سے ایک سطحی نظر سے دیکھنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔ ہم اپنی نادانی سے احکامِ شریعت کی خلاف ورزی کا ارتکاب

کرتے ہوئے دنیا کے سامنے اسلام کا ایک باطل نمونہ
پیش کرتے ہیں۔ بلاشبہ کوئی مسلمان دیدہ دانستہ قانونِ
شریعت کی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہو گا۔ لیکن ہمارے
عمل کی شہادت ہمارے نزدیک تو ایک باطل شہادت
ہے۔ لیکن ہمارے اعمال کی اس شہادت نے ہی
ہمارے دین کو بے اندازہ نقصان پہنچایا ہے۔ ہندوستان
کے مسلمانوں کی بے پناہ اکثریت اس حقیقت سے
قطعاً ناآشنا معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے مرد و عورت
کے تعلقات سے متعلق ایک ایسا نظام اور ایسا
مطمحِ نظر پیش کیا ہے جو یورپ کے مہذب ترین لوگوں
کے نظام یا عدمِ نظام اور مطمحِ نظر کا مقابلہ کر سکتا ہے
ہندوستان کے مسلمان نامعقول اور ظالمانہ غیر اسلامی
رسوم پر اس طرح فریفتہ ہیں کہ گویا عورت کی مغربی آزادی
کا جواب ایک عاجزانہ اعتراف شکست ہے۔

شادی

اسلامی نکاح عورت کو باندی بنا دینے والا کوئی

ضابطہ الٰہی نہیں یہ تو ایک سول معاہدہ ہے جو مساوی الحیثیت
فریقین میں سے کسی ایک کی مرضی پر فسخ ہو سکتا ہے
اگرچہ اُن اسباب کی بنا پر جو اس آئین کی ابتدا کے
زمانے میں زیادہ مستحکم تھے اور جن کی اہمیت آج
بھی برابر قائم ہے مرد کے لئے اس معاہدہ کی تنسیخ
میں مقابلتہً زیادہ آسانی ملحوظ رکھی گئی ہے اگر جو کچھ
میں سُنتا ہوں سچ ہے تو مجھے اس امر کے اعلان
میں قطعاً باک نہیں کہ ہندوستان میں اکثر مسلمانوں نے
عورت کی حیثیت سے متعلق ہندوؤں کے خیالات کا
اثر قبول کر لیا ہے مثلاً شادی۔ نکاح بیوگان اور وراثت
سے متعلق۔ میں دوبارہ یہ امر آپ حضرات کے
ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ شریعت اسلامی کی
خلاف ورزی بلا خوف تعزیر نہیں کی جا سکتی اور یہ کہ
قوانین شرعی جامد اور ساکت نہیں بلکہ بدلتے ہوئے
زمانہ کی ضروریات کے ساتھ اُن میں معقول اطلاق کی
صلاحیت ہے شرعی قوانین تو ایک صراطِ مستقیم کی
طرف رہنمائی کرتے ہیں وہ اُن حدود کا تعین کرتے ہیں

جن کا قائم رکھنا ضروری ہے وہ اس وابستہ پر ڈال دیتے ہیں جس پر چلنا لازمی ہے لیکن ہر زمانہ میں اُن کی تفاصیل اور جزئیات اس رہنمائی کی روشنی اور حالات کے اقتضا سے طے کرنی ہوتی ہیں اسلام کہ حقیقت میں انسانی ترقی کا مذہب ہے کبھی بھی انسانی دل و دماغ کی نشو و نما کو روک دینے اور ایک جذبہ پستی و ذلت مسلط کرنے والے حالات کا حامی اور ظلم و غلامی کا روا دار نہیں ہو سکتا۔ اسلام ترقی۔ انصاف اور آزادی کا پیغام ہے۔

کہا گیا ہے کہ اسلام میں عورت کی حیثیت کا نظریہ مردوں کا نظریہ ہے اور عیسائیت میں عورت کی حیثیت خود نسوانی نقطۂ نظر ہی ہے اس خیال پر اس قدر اور اضافہ ہونا چاہیئے کہ عالم عیسائیت میں ہمیشہ مردوں کی حکمرانی رہی ہے اس لئے عیسائی نقطۂ نظر کبھی منت پذیر عمل نہیں ہوا بلکہ بلحاظ نظریہ اس میں کتنی ہی اُلجھنیں پیدا ہوئی ہیں اور عمل کے اعتبار سے تو اس میں گوناگوں تضاد رہا ہے۔ ربانی نسائیت کے

ایک جذباتی نصب العین کے ماننے والے اسلامی نظریہ
کی قدر و قیمت کے صحیح اندازے سے عاجز ہیں اور اسلام
کو ایشیائی عورت کی معاشری اور اخلاقی پستی اور ذلت
کا ذمہ دار گردانتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو بھول
جاتے ہیں کہ دنیائے عیسائیت میں عورتوں کی کم از کم
ایک قلیل تعداد تو ایسی قعرِ مذلت میں گری ہوئی ہے کہ
مسلمان اُس کے تصور سے لرز جاتا ہے اُن کی اکثریت
اپنے فطری وظائف کی ادائگی سے محروم بنا دی جاتی ہے
مسلمان اسے ایک بہت بڑی زیادتی سمجھتے ہیں۔
اس حقیقت سے کسی کو یا رائے انکار نہیں کہ
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ عالم میں عورتوں
کے حقوق کے سب سے بڑے علمبردار ہیں حضورؐ نے
عورت کو ذلت کی خوفناک پستیوں سے اُٹھا کر اُن
بلندیوں تک پہنچا دیا جن کے ورے عالم خیال ہو تو ہو
اور کچھ نہیں۔ ظہور قدسی کے وقت اہل عرب عورت کو
حد درجہ ذلیل و حقیر جانتے تھے۔ اُن سے بدسلوکی کرتے
تھے۔ انہیں دغا دیتے تھے اُن سے نفرت و حقارت

سے پیش آتے تھے۔ کیونکہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝

ترجمہ۔ اے ایمان والو تمہیں یہ حلال نہیں ہے کہ عورتوں کے زبردستی وارث ہو جاؤ۔ اور ان کو منع نہ کرو (شدت کر کے) کہ تم نے جو کچھ انہیں دیا ہے ان میں سے کچھ لے لو۔ مگر اس وقت کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کریں نکوئی کے ساتھ ان کے ساتھ معاشرت کرو۔ اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو۔ تو قریب ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت بھلائی رکھ دے۔

ایام جاہلیت میں عرب لڑکی کے پیدا ہونے کو ایک آفت اور مصیبت سمجھتے تھے ایسی لڑکیاں جو زائد از ضرورت سمجھی جاتی تھیں زندہ گاڑ دی جاتی تھیں قرآن کریم سے

پوری سختی سے اس رسم کا قلع قمع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ایسی رسوم و عادات کا بھی خاتمہ کر دیا جو اس سے کسی صورت کم ظالمانہ یا نامنصفانہ نہ تھیں۔ قرآن عورت کو ایک مخصوص اور معین قابل احترام مرتبہ بخشتا ہے اور بنی نوع انسان کو اُن سے مروّت اور عزت سے پیش آنے کا حکم دیتا ہے۔

رسول کریمؐ کا ارشاد ہے۔

"عورتیں مردوں کا جڑواں نصف ہیں"

"جب عورت پانچوں وقت نماز ادا کرتی ہے ماہِ رمضان کے روزے رکھتی ہے۔ پاکدامن ہے اور خاوند کی نافرمان نہیں تو اُسے کہہ دو کہ جنّت میں جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے"

"جنّت ماں کے قدموں کے نیچے ہے"

"عورتوں کے حقوق مقدّس ہیں اس امر کی احتیاط رکھو کہ عورتیں اپنے حقوق سے بہرہ ور رہیں"

"جو شخص لڑکیوں کی خدمت کرے گا دوزخ کی آگ اُس پہ حرام ہو گی" "جو شخص دو بیٹیوں کی اُن کے بلوغ

تک نگہداشت کرے گا اگلی دُنیا میں اسی طرح میرے ساتھ ہو گا جس طرح ہاتھ کی دو انگلیاں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتی ہیں" "طلاق اللہ کے نزدیک جائز چیزوں میں سب سے زیادہ مکروہ ہے"

"کیا میں تم کو یہ نہ بتاؤں کہ بہترین نیکی کیا ہے۔ بہترین نیکی یہ ہے کہ اپنی لڑکی کے ساتھ جب اسے خاوند طلاق دے کر واپس بھیج دے نرمی سے پیش آؤ" "جس کے ہاں کوئی لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ نہ گاڑ دے۔ نہ اسے ملامت کرے اور نہ دوسرے بچوں سے اس کے مقابلہ میں بہتر سلوک کرے خدا اُسے جنت میں داخل کرے گا"

حضور نبی کریم صلعم کی ذاتی تعلیمات ظلم و زیادتی بالخصوص عورتوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کی مخالف ہیں ارشاد نبوی ہے کہ "تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جس کا سلوک اپنی بیوی سے عمدہ ترین ہے" حضورؐ کی زندگی میں عورتوں پر لطف و احسان کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ نبی کریم صلعم نے اس عورت کو بھی معاف فرما دیا جس

نے حضورؐ کے کھانے میں زہر ملایا تھا جس کے اثر سے
حضورؐ کا ایک رفیق جنّت کو سدھارا اور خود حضورؐ ایک
نہایت ہی اذیت دینے والی اور عود کرنے والی بیماری
میں مبتلا ہو گئے اور بالآخر اُسی سے انتقال فرمایا۔ قرآن حکیم
نے خود عملی مشکلات کی عدم موجودگی میں سینکڑوں مرتبہ
رحم اور عفو کو انتقام اور سزا سے بہتر قرار دیا ہے۔
اگر عفو و درگذر سیاسی طور پر انسانیت کے خلاف
خود ایک جُرم نہیں بن جاتی ہے اگر مرد یا عورت
انفرادی طور پر عفو و معافی کی حقیقی قابلیت رکھتی ہے
اور دل سے تمام کدورت اور میل یکسر دُور کر سکتی ہیں
تو عفو و درگذر کا صحیح محل ہے وگرنہ یہ بُرائی دوگنی
اور چوگنی ہو کر سوسائٹی پر مسلّط ہوتی چلی جائے گی۔
مسلمانوں میں عورت کی حیثیت سے متعلق مغرب
میں اس قدر غلط بیانی کی گئی ہے کہ یورپ اور امریکہ
میں اب تک لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مسلمان عورت کو
ذی روح ہی نہیں مانتے۔ قرآن کریم نے جہاں تک
اللہ سے اُن کا تعلق ہے مسلمان مردوں اور عورتوں

میں کوئی تفریق نہیں کی۔ دونوں کے لئے نیکی کی جزا اور بدی کی سزا یکساں ہے ۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقَاتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ٥

ترجمہ ۔ بیشک مسلمان مرد اور عورتیں مومن مرد اور مومن عورتیں ۔ تلاوت کرنے والے اور تلاوت کرنے والیاں سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں ۔ صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں ۔ عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں ۔ صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں ۔ روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں ۔ اپنی شرم گاہ کی حفاظت

کرنے والے اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرنے والیاں۔
اور اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے اور یاد
کرنے والیاں۔ اللہ نے ان لوگوں کے لئے بخشش اور
بڑا اجر تیار کیا ہے۔

مسلمان مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات میں
ایک تفریق یعنی اختلافِ وظائف کو جو حقیقتہً موجود ہے
تسلیم کیا گیا ہے۔ ایک آیت میں جس سے ایامِ جاہلیت
کے عرب جو عورت کو تمام حقوقِ انسانی سے محروم سمجھتے
تھے بھونچکا گئے ہوں گے ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ
وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ
عَزِيزٌ حَكِيمٌ ٥

ترجمہ۔ ان عورتوں کے لئے اُس جیسا ہی ہے
جتنا ان مردوں پہ اچھی طرح (معاشرت کے) مردوں
کے لئے ان عورتوں پہ درجہ ہے (فضیلت) اللہ غالب
حکمت والا ہے۔

نکاح بیوگان

عرب میں ظہور اسلام سے قبل بیواؤں کی حالت حد درجہ المناک اور یاس انگیز تھی۔ قرآنِ کریم نے نکاح بیوگان کو جائز قرار دیا۔ عورت کو ایک مرد سے طلاق حاصل کرکے دوسرے سے شادی کا حق بخشا اور اس طرح شادی کو جو فی الحقیقت عورت کو مرد کی ایک لونڈی باندی بنا دیتی تھی ایک سول معاہدہ کی حیثیت بخشی ہے جسے فریقین اپنی صوابدید پر فسخ کر سکتے ہیں اسی حق تنسیخ پر چند پابندیاں عائد ہیں جو قدرتی اسباب کی بنا پر عورت کے لئے ذرا زیادہ شدید ہیں۔ یہ پابندیاں اس لئے عائد اور یہ حدود اس لئے معین کی گئی ہیں کہ فریقین آخری مفارقت سے پہلے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر لیں۔ اسی طرح خاوند یعنی ایک فریق معاہدہ کی وفات پر معاہدہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

حضور سرورِ کائناتؐ نے جب عرب کی بادشاہت حضورؐ کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف ہو چکی تھی متعدد بیواؤں

سے عقد کیا تاکہ ایک طرف تو بیواؤں کے خلاف نفرت
کا جو جذبہ عرب میں موجود ہے اُس کا قلع قمع ہو جائے۔
اور دوسری طرف بادشاہ کی حیثیت سے آنحضرت پر
بیواؤں کے بسر اوقات کی جو ذمّہ داری تھی وہ ایک
انداز میں پوری ہو سکے۔

تعدد زوجات

اب میں تعدد ازدواج کے مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا
ہوں۔ظہور اسلام سے قبل تمام عرب تعدد ازدواج پر عامل
تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ تمام عرب میں عورت کے
ساتھ مرد کے تعلقات پر کوئی قانونی یا مذہبی قیود نہ تھیں۔
اسلام نے ہی ایسی حدود مقرر کرکے اُس سوسائٹی کی
ہیئت بدل دی۔مغربی مصنّفین شرع اسلامی کے خلاف
یہ بڑا اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں مرد کو ایک بیوی
پر اکتفا کرنے کا صریح حکم نہیں دیا گیا۔حضور سرورکائنات ؐ
کے تمام پیام رحمت ہی سے اس لئے انحراف کیا جاتا
ہے کہ امہات المومنین کی تعداد ایک سے زیادہ تھی۔

جواباً عرض کروں گا کہ تاریخ عالم یک زوجی کی ایسی تابناک مثال پیش کرنے سے عاجز ہے جو آنحضرت صلعم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ۲۶ سالہ ازدواجی زندگی پیش کرتی ہے۔ لیکن وہ رفاقت عدیم النظیر تھی اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پُر مسرّت شادیاں مستثنیات سے ہوتی ہیں اور اگر آنحضرت صلعم کا تجربہ وہیں تک محدود ہوتا تو نوع انسان کے لئے آنحضرت صلعم کی مثال کا افادہ اس لحاظ سے قلیل ہوتا۔

آنحضرت صلعم نے اپنی زندگی میں ایک بیوی اور متعدد بیویوں کے ساتھ شادی کا کامل نمونہ ہمارے لئے پیش فرما دیا ہے۔ یہ نہایت ہی بہتر ہوا کیونکہ اُس زمانے میں مردوں کی اکثریت کثرتِ ازدواج پر عامل تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس طریق پر اُن کا عمل اب تک برابر جاری ہے۔

بعض اوقات لوگ تعدد زوجات کو اسلام کا ایک مسلک قرار دے دیتے ہیں۔ تعدد ازدواج اسلام کے شعائر میں سے اسی طرح نہیں ہے جس طرح یہ عیسائیت کے

شعائر میں سے نہیں یہ تو ایک انسانی کمزوری ہے جسے مرد و عورت دونوں اور زیادہ تر عورت ہی کے مفاد میں ایک ضابطہ کے اندر لانے کی ضرورت ہے۔ مغربی ممالک میں یک زوجی پر کبھی عمل تو ہوا نہیں بلکہ یک زوجی کی آڑ میں لاتعداد عورتوں اور اُن کے بچوں پر ناگفتہ بہ مظالم توڑے گئے ہیں۔ اسلام تمام موہوم ضابطوں کو منسوخ کرتا ہے جن کی بدولت خدا کی کثیر مخلوق اپنے جائز مرتبے سے محروم ہو جاتی ہے۔ یورپ میں عورت کی پرستش کے ساتھ ساتھ اُس کی حد درجہ تذلیل کے مناظر عام ہیں۔

تعدد ازدواج کے نظام اسلامی پر اگر پوری طرح عمل کیا جائے تو اغوا کے خطرات۔ عصمت فروشی کی ہولناکیوں اور دوسری لاتعداد سفاکیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو یورپ میں عورتوں کو تعدد ازدواج کی زبانی مخالفت کی بنا پر برداشت کرنی پڑتی ہیں نظام اسلامی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر مرد ہر عورت کی طرف اپنی توجہ اور اُس کے نتائج کا ذمہ دار ہے۔

نظام شرعی اگر اُس خیالی و رومانی دنیا کو جو مغربی مصنفین نے مرد و عورت کے جنسی تعلقات پر آباد کر رکھی ہے برباد کر دیتا ہے تو عیب کی کیا بات ہے۔

موجودہ مغربی ادب میں عورت کا مقام تلاش کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مرد کی زندگی کا مقصد وحید عورت کی محبت ہے اور نصب العین یہ ہے کہ وہ ایک ہی عورت ہے۔ جسے وہ کئی عورتوں کو برتنے کے بعد پا لیتا ہے۔ جب وہ عورت مل جاتی ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ " روحوں کا ملاپ عمل میں آگیا ہے اور یہی مقصود زندگی ہے۔ کیا یہ عقل و ہوش اور حقیقت ہے لیکن یہ تو حماقت و جہالت اور ایک نظریۂ باطل ہے شاید اس خیال کا سرچشمہ عیسائیت ہی کی تعلیم ہے وہاں عورت فطرتاً گنہگار ایک سحر آفریں مخلوق ممنوعہ ہے سوائے اُس صورت کے کسی پادری کی دعا و برکت سے ایک ناقابلِ فہم اتحاد عمل میں آ جائے۔

اسلام کی تعلیم اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں شادی روحوں کے موہوم ملاپ کا (جس کی تلاش میں دُنیا بھٹک

گئی ہے) نام نہیں ۔ باہمی ہمدردی اور تھوڑی بہت محبت تو بلاشبہ ممکن ہے لیکن ہر روح انسانی مہد سے لحد تک اکیلی ہی ہوتی ہے جب تک کہ اُسے خدا تک پہنچانے کا کوئی وسیلہ میسّر نہ آجائے ۔ ہر انسان کی روح دوسری انسانی ارواح سے آزاد و مختار ہے ۔ ہر روح خود پورے طور پر اپنے اعمال کے لئے جوابدہ ہے اپنا بوجھ اُسے خود ہی اُٹھانا ہوتا ہے اور دنیا کے ہجوم آلام و فرائض میں اُسے اپنا راستہ خود ہی تلاش کرنا ہوتا ہے ۔ مرد و عورت میں اس باب میں کوئی فرق نہیں، شادی میں ہستیوں کے ایک دوسرے میں ضم ہو جانے کا کوئی سوال نہیں ۔ ہر ہستی علیحدہ اور آزاد رہتی ہے ۔ میاں بیوی تو ایک دوسرے سے متعلق بعض فرائض کی انجام دہی کے لئے ایک معاہدہ کی رُو سے متحد ہوئے ہیں ۔ یہ معاہدہ باہمی محبت و جذبہ رفاقت سے مقدّس و مستقل بنایا جا سکتا ہے ۔ اگر باہمی رفاقت و محبت حاصل نہ ہو تو اس معاہدہ کی تنسیخ ہی بہتر ہے شادی کوئی ناقابلِ فہم آسمانی فیصلہ نہیں یہ تو اللہ کے ایک آزاد بندے اور آزاد

بندی کے درمیان ایک قسم کا سول معاہدہ ہے اللہ نے میاں بیوی کے درمیان باہمی محبت کا حکم دیا ہے اُن میں سے ایک کے حقوق دوسرے پر صاف صاف معین کر دیئے ہیں اور اُن پر شائستگی اور آبرو کے چند قواعد کی پابندی لازمی کر دی گئی ہے۔ اگر اُن کے دلوں میں باہمی محبت اور جذبہ رفاقت پیدا نہیں ہوتا اور انہیں اندیشہ ہے کہ وہ حدود معیّنہ کا احترام نہیں کرسکیں گے تو معاہدہ ختم ہو جانا چاہیئے۔

یک زوجی اور تعدد زوجات دونوں صورتوں میں عورت اپنی مکمل ہستی۔ رائے۔ آزادی عمل۔ جائداد اور نام کو بحال و برقرار رکھتی ہے اور دوسری بیویوں کی موجودگی میں تو وہ علیحدہ رہائش کا مطالبہ بھی کر سکتی ہے۔ اس لئے عورت کے لئے یہ چنداں مضائقہ کی بات نہیں کہ سوسائٹی کا عمل یک زوجی پر ہے یا کثرتِ ازدواج پر۔

کثرتِ زوجات پر یورپ کے نیم مذہبی اعتراض کی بنا شادی کو ایک قطعاً اٹل آسمانی فیصلہ تصوّر کرنا ہے

ان لوگوں کے خیال میں شادی ایک ایسا اتحاد مرد و زن ہے جس میں عورت اپنی شخصیت کو یکسر فنا کر دیتی ہے مرد کے لئے ایک ہی بیوی دکھنا ہمیشہ کی طرح اب بھی اسلام کا مطمح نظر ہے لیکن صرف مطمح نظر ہی ہے حقیقت میں یک زوجی شادی عملاً بعض صورتوں میں خانگی عدم مسرّت کا موجب بن جاتی اور خطرناک معاشری عیوب کا سرچشمہ ثابت ہوتی ہے۔ قانون اسلام کا منشا شادی کو انسان کے لئے ایک سرمایۂ مسرّت بنانا ہے اسی لئے اُس نے بدیہی انسانی کمزوریوں کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے جب شادی مسرّت کے بجائے اذیّت کا موجب بن جائے طلاق کی اجازت بھی دے رکھی ہے یورپین ممالک میں پہلے تو طلاق کا نام و نشان تک نہ تھا اب انصاف اور معقولیت کی بنا پر یورپ کے اکثر ممالک میں طلاق کو قانوناً جائز قرار دے لیا گیا ہے لیکن یورپ میں طلاق اتہام و بہتان کی حد درجہ ناروا تشہیر کی بنا پر خود ایک مستقل معاشری عذاب بن کر رہ گئی ہے لیکن اسلامی طریق طلاق اس بیہودگی سے پاک ہے۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں میں پُرمسرّت

شادیاں یورپ والوں سے کم نہیں ہوتیں۔ مرد کے لئے ایک سے زائد عورتوں سے شادی کرنا اسلام کا کوئی آئین نہیں یہ تو فطرت انسانی کے لئے ایک رعایت کا اہتمام ہے۔ قرآن کریم تعدد زوجات کا حکم نہیں فرماتا بلکہ مخصوص حالات میں عورتوں کو بلا محافظ اور محض بے بس چھوڑ دینے سے بہتر ہونے کی سفارش کرتا ہے۔ تعدد زوجات کی اجازت مندرجۂ ذیل آیات میں موجود ہے جن کا نزول اُس وقت ہوا جب مسلمانوں کی قلیل جماعت میں سے بھی دس فی صدی مرد شہید ہو چکے تھے اور جب بہت سی عورتیں جن میں سے اکثر کی گودوں میں بچے تھے قید ہو کر آئی تھیں۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى

اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝

ترجمہ۔ یتیموں کو ان کے مال دے دو اور ناپاک کو پاک کے ساتھ نہ بدل دو۔ اور یتیموں کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے اگر تم ڈرتے ہو کہ یتیم عورتوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکوگے تو ان کے سوا جو تمہیں پسند آئیں دو دو یا تین تین۔ یا چار چار عورتوں سے نکاح کر لو۔ اور اگر تم ڈرتے ہو کہ عدل نہ کر سکوگے، تو ایک ایک ہی عورت سے (نکاح کرو) یا ان عورتوں سے جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے۔ یہ بہت نزدیک ہے اس بات سے کہ تم بے انصافی نہ کرو عورتوں کے مہر ان کو خوشی خوشی دے دو اور اگر وہ خوشی سے تمہیں کچھ اس میں سے دے دیں تو اسے مزے سے کھاؤ ۔

ان آیات کو ان خیالات سے جن کا اظہار مخالفین اسلام کی طرف سے اس سلسلہ میں ہوتا رہتا ہے دور کا

بھی تعلق نہیں آج عالم اسلام میں تعدد زوجات پر نہایت
ہی کم عمل ہو رہا ہے لیکن یہ اجازت اس حقیقت کی
شہادت کے لئے موجود ہے کہ شادی مرد و عورت کے لئے
بنی ہے مرد و عورت شادی کی خاطر نہیں بنے۔

اسلام نے مرد کو ہر عورت کے ساتھ اپنے طرز عمل
کے لئے ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ذمہ داری اور حیا و پاک
دامنی اسلامی اخلاقیات کی بنیاد ہیں انہی کی بدولت وہ
آزادی جس کے ساتھ انسانی مسرت و فلاح توام ہے
نصیب ہو سکتی ہے۔ یورپ کی بے راہ روی جس آزادی
تک پہنچاتی ہے وہ مسلمان کی نظر میں شائستگی کی حدود سے
متجاوز ہو چکی ہے۔

مردوں اور عورتوں کے اختلاط باہمی کے متنازعہ فیہ مسئلہ
کی طرف آئیے۔ اگر یہ سچ ہے اور تجربہ اس پر شاہد عادل
یورپ و امریکہ میں عورتوں کے حقوق کے حامی اس اعلان
سے نہیں تھکتے کہ عورتوں اور مردوں کی دلچسپیاں علیحدہ علیحدہ
ہیں عورتیں روز مرہ کی زندگی میں اپنی ہم جنسوں کے درمیان
زیادہ خوش رہتی ہیں اور مردوں کی غلامی کے جوئے تلے

رہنے کے بجائے ایک آزاد جنس ہی کی طرح ترقی کی اہل ہیں۔
تو پھر وہ اسلامی طریق جس کے ماتحت عورت اپنے حلقہ
میں مالکہ ہے عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔
اسلامی طریق میں افزائش نسل کی رعایت ملحوظ ہے۔
عورت اور اُس کے خاوند اور عورت اور اُس کے دوسرے
قریبی رشتہ داروں کے درمیان رشتے کی نزاکت وہی ہے
جو مغرب میں ہے لیکن عورت کی معاشرتی یا سماجی زندگی
کا حلقہ خود اُس کی اپنی ہم جنسوں تک ہی محدود ہے۔
اسلامی طریق میں مردوں اور عورتوں کے مخلوط غسل۔ مخلوط
ناچ اور باہمی نمائش و معاشقہ کی گنجائش نہیں۔ اسلام
کی حقیقی تعلیم کے ماتحت عورت کے لئے ترقی کے امکانات
غیر محدود ہیں۔
عورتوں کے لئے عورتیں ہی ڈاکٹر۔ وکیل۔ جج۔ سائنسدان
اور علمائے دینیات ہو سکتی ہیں اور ایسا کرنے کے لئے
کوئی سچا مسلمان اُن پر رسول مقبولؐ کے ارشاد کی مطابقت
و متابعت میں حصول علم کی راہیں بند نہیں کر سکتا۔ لیکن
اگر انسانی ترقی کے اس میدان ہی کی سیر مقصود ہو تو

بھی مغربی کی احمقانہ نقالی سے کام نہیں نکل سکتا ۔ کیونکہ عورت کی آزادی کے مغربی تصوّر اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں بے حد اختلاف ہے ۔

مغربی عورتوں کو تو زمانہ حال ہی میں شادی شدہ عورتوں کے حقوق جائیداد جیسے معمولی قانونی حقوق کے لئے خود جد و جہد کرنی پڑی ایسے حقوق تو عورت کے لئے اسلام میں روزِ اوّل ہی سے مسلّم چلے آئے ہیں۔ مغربی عورتوں کو ایک مسلسل اور شدید دوڑ دھوپ کے بعد مغربی مردوں کو باور کرانے میں کامیابی حاصل ہوئی کہ عورتوں کی دلچسپیاں مردوں کی دلچسپیوں سے مختلف ہیں۔ شریعت نے اس حقیقت کا پہلے ہی پورا پورا اعتراف کیا ہے۔

مغرب میں عورتوں کو اپنے قانونی اور سول حقوق کے تسلیم کرانے کے لئے ایک جانکاہ تگ و دَو کرنی پڑی حالانکہ اسلام نے اُن کا یہ حق از خود تسلیم کر رکھا ہے اب اُن کی اپنی پردہ انجمنیں ہیں اور یہ بڑے بڑے اسلامی ممالک میں عورتوں کو عرصہ سے میسّر رہی ہیں۔ مغربی عورتوں اور مسلمان عورتوں کی حیثیت میں اور حصول حیثیت کی

کوشش میں بہت فرق ہے۔ اسلام میں مردوں نے عورتوں کے حقوق کو خود تسلیم کیا اور اگر اقتضا حالات کی بنا پر ان حقوق کی کسی شکل میں توسیع کی ضرورت پیش آئے تو منشا و مقصود شرعی کے پیش نظر مسلمان عورتوں کے ایسے حقوق تسلیم کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ مسلمان عورتوں کی حریت پسندی مرد و عورت میں جنگ و جدل کی صورت اختیار نہیں کر سکتی۔ لہذا مسلمان عورت اور مغربی عورت کی حیثیت میں حقیقتاً کوئی مماثلت نہیں۔

شادی کے اسلامی طریق پر بعض اوقات یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ لڑکی کو خاوند کے انتخاب میں مجال دخل نہیں بلکہ اس کے لئے والدین ہی خاوند منتخب کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ طریق صرف مسلمانوں ہی سے مخصوص نہیں متعدد مغربی ممالک میں بھی یہی مسلک زیر عمل ہے۔ اقوام عالم میں سے کسے اس حقیقت کے اعتراف سے یا رائے انکار ہے کہ جب کوئی کمسن لڑکی اپنے لئے ایسا شوہر منتخب کرتی ہے جس پر اس کے والدین کو اعتراض ہے تو وہ لڑکی اپنے لئے ایک بڑی ہی مصیبت

خرید رہی ہے۔ برخلاف اس کے مسلمان والدین اپنی لڑکی کو ایسے مرد کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر جسے وہ ناپسند کرتی ہے اصرار نہ کریں گے وہ اپنے میکے واپس آسکتی ہے۔

ٹرکی میں جہاں بالغ لڑکیوں کے لئے محرموں کا حلقہ اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ اس میں شادی کے قابل رشتہ دار لڑکے شامل ہیں میرے ایک دوست کی لڑکی نے باپ سے کہا کہ وہ فلاں بے سے شادی کرنا چاہتی ہے باپ نے کہا "بہت بہتر۔ لیکن بیٹی اس بات کو خوب سمجھ لو۔ جب تم ایک قدیم طریق کی خلاف ورزی پر دلیر ہو تو وہ تمام رسوم اپنے آپ ختم ہو جائیں گی جو اس طریق سے وابستہ رہی ہیں۔ اگر تم فلاں بے سے شادی کرنا چاہتی ہو اور میری رائے اس کے خلاف ہے اور یاد رکھو کہ میں مردوں کو تمہاری نسبت بہتر سمجھ سکتا ہوں۔ تو پھر ناچاقی اور طلاق کی صورت میں میکے کے دروازے بھی تم پر کھلے نہ رہنے چاہئیں اگر تم اپنے لئے میری پسند کو قبول کر لو تو قانون اور رواج

ماتحت خدانخواستہ تمہاری ازدواجی زندگی میں ناگواری پیدا ہو تو میں تمہیں اپنی پناہ میں لینے پر مجبور ہوں۔ میری دعائیں تمہارے شامل حال ہیں۔ اپنا راستہ خود پسند کر لو۔"
لڑکی اپنے ارادے سے باز آ گئی اور اُس نے اپنے والد کے تجربے اور واقفیت کو انتخاب شوہر میں اپنے لئے بہتر سمجھا۔

جب مسلمان عورتوں کی آزادی پر بحث و غور کریں تو انہیں اسلامی نصب العین پیشِ نظر دکھنا چاہیئے وگرنہ چشمہ حیات کے عوض سراب کی لامتناہی جستجو میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ہمیں ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیئے اور میں پھر بہ تکرار عرض کرتا ہوں کہ شریعت اسلامیہ کے قوانین جامد اور ساکت نہیں زندگی کی ضروریات کا ہر زمانے میں ساتھ دینے والے ہیں۔ شریعت اُن قواعد سے جو کسی زمانے میں وضع کر لئے گئے ہیں بالاتر ہے اور یہ کہ عورتوں کے حقوق اُن کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مردوں کی طرح عورتوں کے لئے بھی اسلام کا قانون مدار ہے۔ اسلام

کا نصب العین بنی نوع انسان کی عالمگیر اخوت ہے۔ نوع انسان میں مردوں کی طرح عورتیں بھی شامل ہیں اور اسلام کی اس منزل معینہ تک پہنچنا اس وقت تک قطعاً ناممکن ہے جب تک عورت کی حیثیت وہی ہے جو آج مشرق و مغرب میں اس پر مسلط یا جس میں اسے ہم نے مبتلا کر رکھا ہے۔

خطبۂ ہشتم

حکومت الٰہیہ یا مدینۂ اسلام

اب تک تو میں آپ حضرات سے زیادہ تر ماضی کی داستانیں کہتا رہا اب اپنے اس اختتامی خطبے میں اپنی توجہ عہد حاضر پر مرکوز کرنا چاہتا ہوں میں دکھا چکا ہوں کہ انسانی عمل و ارتباط کے کسی شعبے میں اسلام کا معیار عہد حاضر کے بلند ترین معیارات سے لگا کھاتا ہے۔ لیکن اے وائے محرومی خود مسلمان کا اپنا عمل اس بلند معیار کے لئے وجہ ندامت بن رہا ہے۔ میں اسلامی سلطنت

کی سیاسی قوت کے زوال اور تہذیب اسلامی کے انحطاط کے اسباب اپنی بصیرت کے مطابق آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں میں نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ اس زوال و انحطاط نے شریعت حقہ میں مسلمانوں کے ایمان کو متزلزل کرنے کے بجائے انہیں اس پر مستحکم کر دیا ہے کیونکہ اب انہیں صاف صاف دکھائی دے رہا ہے کہ ان کی درماندگی کا سبب احکام شریعت سے سرتابی کے سوائے کچھ بھی نہیں۔ چند ارشادات قدسی نمونتہً سن لیجئے :-

۱۔ تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کا مذہبی فریضہ ہے۔

۲۔ علم حاصل کرو خواہ اس کی تلاش میں چین تک جانا پڑے۔

۳۔ خدا کی مخلوق کے مطالعے اور تدبر میں صرف کی ہوئی ایک ساعت سال بھر کی عبادت سے افضل ہے۔

۴۔ ؎ گفت پیغمبر بہ آواز بلند
بر توکل زانوے اشتر ببند

احکام اسلام سے انحراف کرنے والوں پر واضح ہوچکا ہے کہ اُن کی زبوں حالی اِن اور اِن جیسے اور بہت سے سادہ و پُر مغز احکام سے سرتابی کا نتیجہ ہے۔
مسلمانوں کو آج صاف صاف نظر آرہا ہے کہ اقوام مغرب کی معاشی کامرانی شریعت اسلامیہ کے اُن احکام کی متابعت کا صلہ ہے جو مادی ترقی اور معاشی مرفہ الحالی کے ضامن ہیں اور جنہیں مسلمانوں نے اپنی حماقت سے اپنے دَورِ زوال میں پسِ پشت ڈال دیا تھا مغرب والوں نے شرایعت اسلامیہ کے ایسے بنیادی اصولوں کو جن سے عیسائیت اُس وقت بیگانہ تھی جب اُس کی باگ ڈور چرچ کے ہاتھ میں تھی قبول کر لیا۔ تدبر۔ حریت فکر۔ مذہبی رواداری۔ قانون اور معاشرہ میں کسی انسان کی حیثیت کا اُس کے عقائد۔ نسب اور اُس کی دولت نہیں اُسی کے اعمال و کردار پر موقوف ہونا۔ قانون کی نظر میں مرد و عورت کی کامل مساوات۔ عورت کے حقِ مِلک کا اعتراف۔ خلع اور عقدِ ثانی کی اجازت۔ طہارتِ جسمانی۔ منشیات کے استعمال کی ممانعت۔ شریعت اسلامیہ کے

یہ تمام اجزا معروفہ جو عیسائی یورپ کے لئے مذہباً مردود تھے اور جنہیں چرچ اب بھی لا مذہبیت کی علامت یا زیادہ سے زیادہ دین کی حدود سے خارج اور محض دنیوی سمجھتا ہے آج مغربی تہذیب کے اجزاء ترکیبی بن چکے اور اُس میں سمو دیئے گئے ہیں۔ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے اور خود عیسائی مصنفین ہی کے ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ افکار نو اور جدید نظام زندگی عیسائیوں نے پہلے زمانے کے مسلمانوں ہی سے حاصل کیا۔ ایک فرق البتہ ضرور ہے۔ اہل یورپ نے ان خیالات و عقائد کو دلیل شرعی نہیں دلیل عقلی سے پایا ہے لیکن مسلمانوں نے انہیں اوّل اوّل دلیل شرعی کی بنا پر اختیار کیا۔ مسلمان پہلے تو ان عقائد پر احکام ربّانی کے ماتحت ایمان لے آئے پھر اُن کے لئے دلائل عقلی تلاش کیں۔ یہ قرین قیاس ہے کہ یورپ جس نے ان احکام کو اولاً دلیل عقلی کی بنا پر قبول کیا ہے انجام کار اُن کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان لے آئے۔ مجھے تو ذاتی طور پر اس کی اُس وقت تک زیادہ اُمید نہیں ہے جب تک یورپ اس

منشائے ربانی پر ایمان نہ لے آئے جس پہ عقل انسانی کا مدار ہے۔ جب تک اہلِ یورپ کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ یہ تمام امور جو عیسائیوں کے لئے دینی نہیں دنیوی ہیں لیکن جن پہ بنی نوع انسان کی رفاہیت کا بڑی حد تک دارو مدار ہے موجودہ ضابطہ مذہب کا صرف ایک جزو ہیں۔ جن کا مخزن الہام ہے اور جب تک اُن میں شریعت کے دوسرے یعنی اُس حصّے کی ضرورت کا احساس (جسے مسلمان مضبوط تھامے ہوئے ہیں) پیدا نہ ہو لے۔ اور یہی حصّہ سیاسی ترقی اور سماجی ثبات کا ضامن ہے مسلمانوں نے تو اس حصّے کو دلیل شرعی کی بنا پر دو تین صدیوں سے مضبوط تھاما ہوا ہے۔ لیکن غیر مسلم تو اُسے صرف دلیل عقلی کی بنا پر قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن اسے دائے دلیل عقلی تو اپنی اُس شکل میں جس میں اور صرف جس میں مادہ پرست دُنیا آج اُسے قبول کر سکتی ہے یعنی عہدِ حاضر میں اسلامی سیاست و ریاست میں اُس کا جاری و ساری ہونا مفقود ہے۔

اخوّت

مسلمان اپنے بعض کارنامے آج بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اخوّت اسلامیہ ہی کو لیجئے۔ مسلمان دنیا میں آج بھی ایک عظیم الشان۔ عدیم النظیر اور وسیع ترین انسانی برادری ہیں اسلامی برادری آپس حسد و باطنی نزاع سے قطعاً پاک ہے جو مغربی سماج کے وجود کے لئے ایک مستقل اور محکم خطرہ ہے۔ مسلمانوں کے ہاں ایک عمل پذیر بین الاقوامی قانون موجود ہے۔ مسلمانوں کے پاس ایک ایسا سماجی ضابطہ موجود ہے جس میں محنت و سرمایہ زمیندار اور مزارعہ کے حقوق۔ حقوق املاک و تنظیم۔ بلکہ ملوکیت۔ دستوریت۔ اشتراکیت۔ امرایت اور جمہوریت کے نظریات کو پورے سلیقے سے سمو دیا گیا ہے۔ اگر آج مسلمان اسلامی نظریۂ حیات کی عملی موافقت میں ایک ترقی پذیر اور کامیاب مملکت کی مثال پیش نہیں کر سکتے اور اگر مسلمان اقوام مادی ترقی کی دوڑ میں مغرب کی گرد کو بھی نہیں پا سکتیں تو مسلمانوں کے لئے مقام تعجب

نہیں ہونا چاہیئے اگر اہل مغرب یہ سمجھنے لگ جائیں کہ ایسی پس ماندہ و ناکام قوموں کا ضابطہ حیات خود ان قوموں کے منشور ہائے زندگی کے مقابلے میں حقیر و فرومایہ ہے۔ آج ہماری حالت کے پیش نظر انہیں اس نتیجہ پر پہنچنے سے کیا چیز روک سکتی ہے۔ اگر نور اسلام اُن کی نظر سے اوجھل ہے تو الزام ہم پر عائد ہوتا ہے اُن پر نہیں۔

دوسرا امر جس نے مسلمانوں کے شریعت حقہ پر ایمان کو دوبارہ مستحکم کر دیا ہے وہ مغربی تہذیب کی علوم طبعی میں حیرت انگیز کامیابی کے باوجود سیاسی اور سماجی علوم میں ایسے مسائل کے حل کرنے میں اُس کی کھلی ہوئی ناکامی ہے جن کا حل اسلام نے آج سے صدیوں پہلے پیش کر دیا تھا۔ ہم سب اس امر پر متفق ہیں کہ حقائق اسلام کی اشاعت ہونی چاہیئے اور جہاں تک ممکن ہو دنیائے جدید کو اُن کے اختیار کرنے کی طرف راغب کرنا چاہیئے لیکن ہم میں سے بعض یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی اصولوں کو دُنیا کے سامنے پیش کرنے کا

طریق یہ ہے کہ شریعت کو تو ایک دفتر پارینہ سمجھ کر خیرباد کہہ دیا جائے اور اسلام کو ایک ایسے مذہب کی حیثیت سے پیش کیا جائے جو اپنا کوئی ضابطہ حیات نہیں رکھتا اور دنیا سے یہ کہا جائے کہ اسلام محض ایک ذاتی عقیدے۔ ایک انداز فکر اور ایک خاص رائے کا نام ہے۔ بعض مسلمان عہد جدید کی فنکارانہ کارگذاری سے مبہوت ہو کر مغرب کے طبعی علوم اور کارناموں ہی کو نہیں مغرب کے سماجی و سیاسی نصب العین کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بلاشبہ مسلمانوں کو مغرب کے علوم طبعی کے حصول کی اشد ضرورت ہے کیونکہ اُن کے حصول کے بغیر احکام شرعی کی متابعت مدت سے تشنۂ تکمیل ہے۔ لیکن جیسا سعد حلیم پاشا نے اپنی قابل قدر اور ممتاز کتاب "اسلام لشمق" میں مسلمانوں کو اس روش کے خلاف متنبہ کیا ہے۔ یہ تو ایک جنون خودکشی کا مظاہرہ ہے۔ مغرب کے علوم طبعی کی ترقی تو صحیح طریق پر ہوئی ہے لیکن اُس کے سماجی اور سیاسی نظام کی نشو و نما اٹکل پچو طریق سے ہوئی ہے۔ مغرب

کے سیاسی و سماجی نظام کی بنیادیں قابل مشاہدہ حقائق پر
نہیں بلکہ ناقابلِ قبول مفروضات پر استوار ہوئی ہیں۔
مغربی نظام زندگی تو محض انگریزوں کی عقل عامہ۔ نامعقول
باتوں کو عملاً کامیاب بنا دینے کے قدرتی ملکہ۔ اُن کی
اعلیٰ دماغی قوت اور اُن کی آب و ہوا کی عمدگی پر موقوف
ہے دگرنہ اب تک اُن کے ملک میں بھی اس نظام
کا اُسی طرح جنازہ نکل چکا ہوتا جس طرح دوسرے یورپی
ممالک مثلاً فرانس۔ روس اور اطالیہ میں اُس کا خاتمہ
ہو چکا ہے۔ اگر شریعت اسلامیہ کے بعض احکام کی
خلاف ورزی کی وجہ سے مسلمانوں پر ادبار چھا گیا ہے
تو اس سے شریعت کے دوسرے حصوں سے انحراف
کی معقولیت کیونکہ لازم آتی ہے بلکہ اسی بنا پر ہم پر
یہ فرض اور بھی زیادہ شدّت سے لازم آتا ہے کہ
شریعت اسلامیہ کو اُس کی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ
حاصل ہو اور ہم اُس کی زیادہ ہوشمندانہ متابعت پر
کمربستہ ہو جائیں۔ ہمیں اس وقت اسلام کے اصول و
احکام کے ایک واضح ضابطہ کی ضرورت ہے جو ہر مسلم

اور مسلمہ کو مہیا کیا جا سکے ۔ موجودہ کتب فقہ میں ہمیں یہ
افسوسناک فروگذاشت نظر آتی ہے کہ ذاتی امور مثلاً نماز
میں قیام کی صورت کو ممانعت قتل کے سے اصولوں کے
برابر درجہ دیا گیا ہے ۔ ہمیں ہمیشہ کے لئے اُن چیزوں میں
جو ابدی اہمیت رکھتی ہیں اور اُن میں جن کا چلن کسی خاص
زمانے میں خاص حالات کے ماتحت ہوا تمیز کرنا سیکھ لینا
چاہیئے وگرنہ ہم میں اسے اکثر کی حالت اُن مبہوت جاہلوں
کی سی ہوگی جو جلی کو خفی سے تمیز نہیں کر سکتے اور اس طرح
اصولوں کو خیر باد کہہ کر فروع کے بکھیڑوں میں اُلجھ کر منزل
مقصود تک پہنچنے کے بجائے راستے کے پیچ و خم میں
کھو کر رہ جاتے ہیں ۔ مسلمانوں کو یورپ سے علوم طبعی میں
آج بیشک بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن سیاسیات اور عمرانیات
میں یورپ آج بھی اُن کا اُستاد ہونے کا فخر حاصل نہیں
کر سکتا ۔ ان امور میں تو اسلام نے تیرہ صدیوں پہلے امن
اور سلامتی کی وہ راہ تلاش کر لی تھی جس کے لئے عیسائیت
آج تک بھٹک رہی ہے ۔ لہذا ہمیں جو مہم درپیش ہے
وہ اسلامی ادارات کو خیر باد کہہ کر اُن کے بجائے مغربی

ادارات کا اختیار کرنا نہیں بلکہ ایسے جدید ادارات کو
اسلامی قالب میں ڈھال کر اُن کے معیار کارگذاری کو
عہد حاضر کی مقتضیات کے مطابق کر دکھانا ہے۔
شہزادہ سعد حلیم کو جن سے مجھے شرف نیاز حاصل تھا
اہم اور نازک دوروں میں سیاسیات کا عملی تجربہ حاصل تھا۔
وہ یورپ کی سیاسیات جدیدہ کے ماہر تھے۔ ایک مصلح
ابنِ مصلح تھے جنہیں اپنے مخصوص منصب و حیثیت کے
تقاضوں کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے وابستہ
مسائل پر غور و خوض کا موقعہ ملا۔ انہیں ایک طرف تو
مغرب میں جرمنی۔ انگلستان اور فرانس کے افکار کا علم تھا
تو دوسری طرف قرآن و سنّت پر بھی عبور حاصل تھا۔
تفسیر و فقہ سے خاصی واقفیت تھی۔ ان ضروری صفات
کی بنا پر وہ عالم اسلام کے لئے ایک جدید مسلک تجویز
کرنے کے ہر طرح اہل تھے۔ اُن کا مشورہ قبولِ مغربیت
نہیں و اسلامیت تھا۔ اُن کے پیشِ نظر ایک آزاد اسلامی
ملک تھا جسے ایک سلطنت اسلامی کا وقار ابھی تک حاصل
تھا اور وہ ملک مرکزِ خلافت بھی تھا۔ انجمن اتحاد و ترقی

کے بیشتر ارکان کی طرح وہ بھی حامیِ خلافت تھے۔ لہذا اُن کا اوّلین مقصد ایک حقیقی اسلامی مملکت کا حالاتِ جدیدہ میں چربہ تیار کرنا اور موجودہ مملکتوں سے اُس کا مقابلہ کرنا تھا۔ ایسے مسائل ہندی مسلمانوں کے لئے فوری اہمیت نہیں رکھتے جیسی وہ ترکوں کے لئے رکھتے تھے۔ (ظہورِ پاکستان کی وجہ سے یہ مسائل ہمارے لئے بھی فوری اور عملی اہمیت کے سرمایہ دار ہیں۔ مترجم) لیکن وہ ہم سب کے لئے اس قدر دلکش ہیں کہ میں ہندی مسلمانوں کے اہم اور فوری مسائل سے پہلے جو میرے گذشتہ خطبات سے متعلق ہیں اُن کا خلاصہ پیش کرونگا اور حسبِ ضرورت اپنی تنقیدات پیش کرتا جاؤنگا۔ پرنس سعد حلیم کو اپنے کام میں ایسی مشکلات کا سامنا تھا جو ہمیں درپیش نہیں کیونکہ اسلامی حکومت کے اس نظریئے کو جو خلفائے راشدین کے زمانے میں زیرِ عمل تھا عہد حاضر کے نظریۂ و عمل کے ساتھ ہم آہنگ کر دکھانا کوئی آسان کام نہیں۔ خلفائے راشدین اگرچہ ایک وسیع و عریض اور عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا تھے اور اگرچہ تمام ممالک میں اُن کی فوجیں اور اُن کے افسر اُن

کے احکام کی قطعی متابعت کو سرمایۂ نجات سمجھتے تھے۔ تاہم مطلق العنان حکمرانوں کی سی خو بو اُن میں نہ پائی جاتی تھی اور فوجی ڈکٹیٹروں یا آمروں کی سی کوئی بات اُن میں ڈھونڈھے سے نہ ملتی تھی۔ وہ مدینہ طیبہ میں سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور وہاں کی مقامی حکومت سے جب تک وہ راستی پر تھی کوئی تعرض نہ کرتے تھے اُن کے ارشادات مسلمانوں کے لئے قطعی واجب التعمیل احکام تھے لیکن افواج اور اُن افسران کے سوائے جن کے ذمہ مفتوحہ علاقوں کی پُر امن تنظیم و تنسیق تھی یہ خلفاء کبھی احکام صادر ہی نہ فرمایا کرتے تھے۔ وہ ہر جمعہ کو مسجد نبوی میں حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے اور اپنے انتظامی اعمال کا خطبہ میں ذکر فرمایا کرتے تھے۔ مذہب۔ قانون اور حکومت کے معاملات میں وہ آخری عدالت مرافعہ تھے۔ وہ اپنے لئے نہ کسی شاہانہ شان و شوکت کے طالب تھے اور نہ اُن کے گرد شاہانہ دربار اور طمطراق کا نام و نشان پایا جاتا تھا۔ اہلِ مدینہ اور دوسرے مسلمانوں سے جو اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ذاتی تعلقات بالکل آزادانہ اور برادرانہ تھے۔ ایک مرتبہ ایک

غریب بڑھیا نے حضرت عمر ابن الخطابؓ کو ایک معمولی نا انصافی سے متہم گردانا۔ لوگ اس بڑھیا کو ہٹا دینا چاہتے تھے۔ لیکن خلیفہ اسلام نے فرمایا بڑھیا کو بولنے دو۔ ہر مسلم اور مسلمہ کا فرض ہے کہ حاکم کے روبرو سچی بات کہے۔"
اس زمانے میں تمام مسلمان قوانین شریعت سے بخوبی آگاہ اور بہ دل و جان اُن کی متابعت پر آمادہ تھے۔ اگر انہیں کسی امر میں شبہ ہوتا تھا تو خلیفہ یا اُس کے نمائندے کے پاس جاتے تھے جو اُن کے شکوک و شبہات کا نہایت سادہ طریق سے ازالہ کر دیتے تھے۔ پولیس کا وجود نہ تھا کیونکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ عوام کی آزادی مسلّم اور اُن کے ادارات خود اختیاری قائم و محکم تھے اور خلیفہ وقت کا کام یہی دیکھنا تھا کہ لوگ ان امور سے بہرہ ور رہیں۔

معاویہ کی تخت نشینی پر ایک تغیر رونما ہوا لیکن وہ اس قدر شدید نہ تھا جس قدر عام طور پر اُسے ظاہر کیا جاتا ہے کیونکہ اصول انتخاب کا کم از کم نظری احترام برقرار تھا۔ معاویہ ثانی نے بسترِ مرگ پر مسلمانوں کو اس امر کی صریح ہدایت کی کہ بہترین مسلمان کو اُس کی جانشینی کے

لئے منتخب کیا جائے۔ اُس وقت تک عرب کی سادگی بھی ایک حد تک قائم تھی۔ اگر بنی اُمیہ نے معاویہ کی وفات پر جانشینی سے انکار کر کے اپنی راستی و صداقت کا ثبوت دیا ہوتا۔ اور ہمیں یہ امر فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ انہیں شام۔ مصر۔ شمالی عرب اور شمالی افریقہ میں اکثریت حاصل تھی اور اس طرح وہ جو کچھ چاہتے کر سکتے تھے۔ اگر وہ صحیح اسلامی طریق پر مسلمانوں میں سے اُن کی خدمات کی بنا پر بہترین آدمی کا انتخاب کرتے تو اُن جرائم کے باوجود جو اُن سے اپنے لئے حصول قوت و ریاست میں سرزد ہوئے اُن کی خدمات اسلامی پر آج تمام مسلمان متفق ہوتے۔ لیکن انہوں نے خاندان پر بنائے خلافت استوار کرنے والی پارٹی کے خلاف اصولاً بے پناہ جنگ وجدل شروع کی۔ کیونکہ سُنّیوں کے اعتقاد کے مطابق ایسا کرنا خود پیغمبرِ اسلام کی خواہش کا عدم احترام تھا اس جنگ وجدل کے باوجود انہوں نے خود ایک خاندان کی بنا ڈالی اور اس طرح ہمارے لئے ایک خالص اسلامی مملکت کے خط و خال مٹا دیئے۔

اقبالؔ نے سچ کہا ہے :-

ے خلافت بر مقام ما گواہی است
حرام است آنچہ برما پادشاہی است
غلام فقر آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است (مترجم)

اُس زمانے سے خلافت اسلامیہ مختلف خاندانوں میں پھرتی رہی ہے تا آنکہ حال ہی میں آل عثمان کے آخری بے ضرر اور برائے نام خلیفہ کا ایک لمحہ کے نوٹس پر ٹرکی سے اخراج عمل میں آیا۔ خلفاء کی طویل فہرست میں بہت سے اچھے اور نیک بخت مسلمان بھی نظر آتے ہیں جن کے عہد میں اسلام اپنی حقیقی درخشانی کے ساتھ پھلا اور پھولا ہے کیونکہ اُن کی حکومت کی عمدگی کے لئے شریعت کی مشعل موجود تھی۔ لیکن خداوند تعالیٰ نے ذاتی ترقی و رفعت کے جذبہ سے متعلق جو حدود مقرر فرمائی ہیں اُن میں سے ایک سے اُس وقت تجاوز کیا گیا جب حین حیات کی فرمانروائی کو موروثی فرمانروائی میں بدل دیا گیا اور خالص حکومت الٰہیہ کے ایک تحفظ کو توڑ دیا گیا۔ اگر ایک خاص نوعیت کی حین حیات انتخابی فرمانروائی آزاد مقامی

ادارات اور حکومت خود اختیاری کے ساتھ جن سے میں بعد میں بحث کرونگا اب تک قائم اور آنے والی صدیوں کی ضروریات کے ساتھ ساتھ وسعت پذیر ہوتی رہتی تو زمانہ حال کی ضروریات کے مطابق ایک اسلامی مملکت کی تعمیر مقابلتاً آسان ہوتی محض چند اصلاحات ہی کی ضرورت پیش آتی۔ موجودہ زمانے میں تو زمانہ قدیم کے ساتھ پیوند جوڑنے کی کوشش ہفت خوان رستم سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن سعد حلیم پاشا نے ہماری خاطر یہ اہم انجام دینے کی بہترین کوشش کی ہے۔ اس طویل انحراف کے بعد میں شہزادہ موصوف کے خیالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

آج مغرب میں مملکت کی صدارت یا منصب اعلیٰ محض دو قسم کے افراد کے لئے وقف ہے ایک تو ایسے لوگ جو کامل اطمینان کے ساتھ حق وراثت کے ماتحت تاج و تخت پر متمکن ہو جاتے ہیں خواہ اُن میں اس منصب کے فرائض کی انجام دہی کی اہلیت موجود ہو یا مفقود ہو۔ دوسرے ایسے اشخاص جو پبلک کے ووٹ سے اس منصب پر منتخب ہو جائیں۔ اس دوسرے طریق عمل کے خلاف

ہمارے مذہبی نقطۂ نظر سے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ انتخاب بہترین اور مسلمہ خدام ملت میں سے نہایت ہی دانشمند لوگوں کی ایک کونسل کی طرف سے عمل میں آئے اور صدر کی میعاد عہدہ یا تو مدت العمر ہو یا اس مدت کے لئے جس مدت تک صدر درست طور پر اپنے وظائف فرمانروائی بجا لاتا رہے۔ یہ طریق غیر مسلموں کے ہاں ایک اٹکل پچو فیصلے کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ حق انتخاب ایک انبوہ کثیر کو دے دیا جاتا ہے جو درست فیصلہ کی اہلیت سے محروم ہوتا ہے اور پھر انتخاب ایسے لوگوں میں سے عمل میں آتا ہے جو از روئے دانش اس حق سے محروم رہنے چاہئیں صدارت کے لئے کوشاں وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں ہوس منصب وجاہ بے چین اور حصول قوت واقتدار کی تگ و دو بیتاب رکھتی ہے۔ قرون اولی کے مسلمانوں میں اقتدار کو مقصود بالذات سمجھ کر حاصل کرنے کی کوشش قطعی نا اہلیت شمار ہوتی تھی۔ مبادا آپ یہ سمجھ بیٹھیں کہ یہ پرانا اسلامی نصب العین کہ اقتدار واختیار ہمارے نبی کریمؐ کی طرح ایسے لوگوں کے پیش کرنا چاہیئے جنہیں اس کی ہوس نہ ہو۔ اور اقتدار

صرف ایسے ہی اشخاص کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ عہد حاضر کے مسلمانوں کی نظر سے فی الحقیقت بالکل اوجھل ہو گیا ہے۔ میں آپ سے عرض کروں گا کہ عہد حاضر کی تجدید اسلام کی سب سے بڑی تحریک میں اس نصب العین کو مذہبی انداز میں پورے پورے طور پر ملحوظ رکھا گیا۔ ترکیہ کی انجمن اتحاد و ترقی کے دستور میں ذاتی ترقی اور منصب پسندی کا جذبہ رکھنے والے لوگوں کو ادنےٰ حیثیت میں رکھا گیا انتظامی اقتدار اعلیٰ اُن لوگوں کے لئے وقف تھا جو قطعاً پبلک کے سامنے نہیں آتے تھے اور ظاہری اقتدار اُن لوگوں کے لئے تھا جو پبلک سے روشناس تو تھے لیکن اقتدار و اختیار کی ذمہ داریوں سے گریزاں اور ظاہری شوکت و طمطراق سے نفور تھے پہلے محمود شوکت پاشا مرحوم کو اور بعد میں سعد حلیم پاشا مرحوم کو ایسے مناصب کے لئے منتخب کیا گیا۔

مشرقی عالم اسلام میں بھی آپ دیکھیں گے کہ وہ آمر جو آج منتخب ہوئے ہیں وہی ہیں جنہوں نے قوم کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے ایک

عارضی اکثریت کے زور سے مخالف پارٹی کو نیست و نابود کر دیا ہو۔ ایسے انتخابات جن میں باہم دگر مقابلہ ہو اسلامی ادارات نہیں کیونکہ اسلام ایسی جماعتوں کے منزہ عن الخطا ہونے کو تسلیم نہیں کرتا جن کے ارکان انفرادی طور پر نا اہل ہوں۔ جاہلوں کی اکثریت پر اُسے کچھ اعتماد نہیں۔

فرمانروا کے انتخاب کا مسئلہ خاصا مشکل ہے۔ اور مسلمانوں میں یہ ایسے دانشور لوگوں کے اختیار میں دیا گیا ہے جو متعلقہ اشخاص یعنی امیدواروں سے واقف ہوں۔ مسلمانوں کی اکثریت کو بحیثیت ایک جماعت کے اس انتخاب میں کچھ دخل حاصل نہیں۔ وہ تو اس انتخاب کی تصدیق و توثیق کرتے ہیں یا اُسے مسترد کر دیتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا صدر ایک معین مدت کے لئے نہیں زندگی بھر کے لئے چُنا جاتا ہے۔ اُسے حکومت کے تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ جہاں تک عوام سے اُس کا تعلق ہے وہ ایک قطعی اختیارات رکھنے والا بادشاہ ہے۔ لیکن جہاں تک شریعت کا تعلق ہے وہ اپنی رعیت کے ادنٰے سے ادنٰے فرد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ مسلمانوں میں سے اور اُن ہی کا سا

ایک مسلمان ہے۔ اُسے روزِ قیامت کا انتظار ہے جب اُسے حاکم الحاکمین کے روبرو اپنے تمام اعمال کے لئے جوابدہی کرنی ہوگی۔ جب تک وہ راہ راست پر ہے لوگ اُسے معزول نہیں کر سکتے لیکن اگر وہ ناراستی پر تُل پڑا ہے تو شریعت لوگوں کو اس سے محاسبہ اور مواخذہ کا حق عطا کرتی ہے اور اگر ضرورت پڑے تو اُسے معزول کیا جا سکتا ہے۔

مغربی جمہوری مملکتوں میں عوام صدر کو اُس کی راست روی کی پاداش میں بھی معزول کر سکتے ہیں بلکہ اُسے ایک عمل راست کی بنا پر محض اس لئے معزول کر سکتے ہیں کہ وہ خود کسی غلط روش کے دلدادہ ہیں۔ اسلامی مملکت میں ایسے امور میں فرمانروا اور رعیت دونوں کی رہنمائی کے لئے ایک معین قانون اور مقرر مسلک موجود ہے۔

اسلام انسان کے جبلی حقوق تسلیم نہیں کرتا۔ حقوق تو اس قسم کے وظائف و فرائض کی انجام دہی اور علم و تجربہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ واضح تر اہلیت و قابلیت کی عدم موجودگی میں سیاسی و سماجی حقوق کا کوئی وجود نہیں۔

مغرب میں حقوق گویا انسان کی گھٹی میں پڑے ہیں اور ان سے بہرہ اندوزی کے لئے اہلیت و قابلیت یا استحقاق کی کوئی شرط نہیں۔ سب سے اہم حقوق یعنی اہم پبلک امور پر حق رائے دہندگی۔ حق قانون سازی اور حق حکمرانی۔ حد درجہ نا اہل لوگوں کو دیئے جاتے ہیں۔ نہایت ہی اہم و نازک قومی مسائل کا اکثریت کے ناقابل اعتبار طریق سے فیصلہ کیا جاتا ہے اقلیت ایسے ممالک میں ایک شکست خوردہ دشمن کی حیثیت رکھتی ہے اور اکثریت کے خلاف اُسے کوئی حقوق حاصل نہیں ہوتے اگرچہ اکثریت کے حصہ میں بے پناہ جہالت کے فخر کے مقابلے میں اقلیت روشن فکر اور صائب الرائے لوگوں پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو۔

ان معنوں میں ایک اسلامی ریاست میں اکثریت و اقلیت کا کوئی وجود نہیں۔ اسلامی ریاست میں ایوان عام کے لئے انتخاب مغرب کی طرح ایسے حلقہ ہائے انتخاب سے عمل میں نہیں آتا جو ہر قسم کے متضاد و مخالف مفادات سے مرکب ہوں اور جن میں انتخاب صرف پارٹی

سے وابستگی کی بنا پر عمل میں آتا ہے۔
اس طرح اکثریت اقلیتوں پر ظلم نہیں ڈھا سکتی۔ فرض کیجیے کہ کسی وقت ایوان عام میں ایک خاص نقطۂ نگاہ رکھنے والی اکثریت کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے وہ اقلیت پر اور اس کے حامیوں پر جیسا مغرب میں دستور ہے (یعنی اقلیت کے مفاد کے خلاف قانون بنا کر) زیادتی نہیں کر سکتی کیونکہ ایک اسلامی ریاست میں ایوان عام کو قانون سازی یا انتظامیہ کے اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔ تمام انتظامی اختیارات ریاست کے حکمران کے سپرد ہوتے ہیں اور وہ اپنے نمائندے مقرر کرتا ہے۔ وہ صرف شریعت کے روبرو جوابدہ ہے۔ قانون سازی کے تمام اختیارات کونسل آف جیورسٹس یا مجلس فقہا کے سپرد ہوتے ہیں۔
نئے قوانین صرف ایسے لوگ ہی وضع کرتے ہیں جو اصول قانون، پر عبور رکھتے ہیں ایسے لوگوں کا انتخاب ایوان عام کی طرف سے ان کثیر التعداد قانون دان حضرات میں سے عمل میں آتا تھا جو ضرور بابت ملت پر ایک وسیع نظر کے ساتھ اپنی روشن خیالی کے لئے ایک شہرت

رکھتے تھے۔ قانون سازی تو روز مرہ کی ضرورت نہیں۔ اس کی ضرورت تو کبھی کبھار لاحق ہوتی ہے۔ اسلامی مملکت کے لئے قانون ایسے ایوان میں وضع نہیں ہوتے جہاں ایک مقتدر فریق اپنے مفاد کو مستحکم کرنے اور فریق مخالف مضرات سے بچنے کے لئے ایک ہولناک آویزش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اسلامی حکومتوں کے قوانین کی بناء محکم خود شریعت اسلامیہ ہے۔ لہذا اسلامی مملکت کے قانون بحیثیت مجموعی عوام کے لئے پرمنفعت ہوتے ہیں۔ ایسے قوانین باہم دگر جنگ کرنے والے سیاسیین کے فکر کا نہیں فقہا کے تدبر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی تفاصیل میں نہیں پڑتے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو یورپ میں پارلیمنٹوں میں پیش ہوتی ہیں اسلامی حکومت میں انتظامیہ کے فیصلوں سے طے پا جاتی ہیں۔

ہم نے یورپ کے انقلابات دیکھے ہیں۔ ایسے انقلابات جماعات کی حیثیات کو زیر و زبر کر دیتے ہیں۔ جو کل ظالم تھے آج خود ظلم کا تختۂ مشق نظر آتے ہیں جو کل تک اپنی معصومیت و مظلومیت کی جگہ خراش داستانیں نشر کرتے

پھرتے تھے آج اُسی طرح ظالم بن جاتے ہیں جس طرح کل دوسرے تھے ۔ یعنی زیر دست زبردست اور زبردست زیردست بن جاتے ہیں ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں مقصد انقلاب سب کے لئے حقوق و امتیازات کی مساوات نہیں بلکہ مخالف کو نیست و نابود کر کے اُس کے جملہ اقتدارات و امتیازات جن میں دوسروں پر جور و ظلم روا رکھنے کا حق بھی شامل سمجھا جاتا ہے حاصل کرنا ہے ۔ انقلاب کے اس مقصد باطل کی علّت غیر ذمّہ دارانہ دولت اور غیر ذمّہ دارانہ اقتدار ہے جو نظریہ کے طور پر یورپ کی کتب سماجی و سیاسی کے علاوہ عملی طور پر یورپ کی تاریخ جدید لبطور مقصود پیش کرتی ہے ۔ ایک ملک کے اندر جس طرح ایک پارٹی دوسری پارٹی کو برباد کرنے پر تلی ہوئی نظر آتی ہے ٹھیک اُسی انداز سے مختلف قومیں ایک دوسری کی ہلاکت و بربادی میں مصروف اور ایک دوسری پر اپنی غلامی مسلّط کرنے میں مشغول ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت کا سماجی و سیاسی نظام 'بدون سلطان' ہے ۔ یہ نظام اُس اقتدار سے محروم ہے

جس کا احترام سب پر لازم ہے۔ یورپی نظام اُس قوت و اقتدار سے محروم ہے جو شریعت اسلامی اپنے سیاسی وسماجی نظام کے لئے مہیا کرتی ہے۔ یورپی نظام اُس قوت و اقتدار کے سوائے جو انسانوں نے ہوس اقتدار میں قوت کے بل عارضی طور پر قائم کر لیا کسی قانون برتر و اقتدار اعلٰے تر سے منکر ہے۔ (اقبال نے اسی خیال کو

کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

کہہ کر ادا کیا تھا۔ مترجم) چونکہ یورپی نظام میں کوئی مقرر و معین حدود نہیں ہیں سوائے اُن کے جو حالات عائد کر دیں۔ لہذا سیاسی وسماجی نظام کے لئے تحفظات کا وجود نہیں اور جہاں لوگ اُن فطری و ربانی قوانین سے جن پر ایک محکم سیاسی وسماجی تعمیر کی بنا رکھی جا سکتی ہے قطعاً نا آشنا ہیں۔ اس اعتبار سے یورپ قبل عیسائیت کی رومن سلطنت کے زمانے میں آغاز عیسائیت کے بعد کے زمانے کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ تھا کیونکہ کافر رومن تو چرچ کی نسبت اس دُنیا میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اہل روما نے شرافت و انسانیت سے کام لیا اور

غیر ذمہ دارانہ قوت کے نظریہ کو عیسائیت کے طرز عمل کے خلاف یوں بلا مقابلہ نہ چھوڑا۔ اُن کے ہاں ایک افسر اعلیٰ ہوا کرتا تھا جس کا نام وکیل عوام تھا جسے یہ حق حاصل تھا کہ عوام بلکہ افراد کی طرف سے حکومت سے جواب طلبی کرے۔ وکیل عوام عام طور پر اپنے اس حق کا استعمال کیا کرتا تھا۔ اسی رومن طریق کا کچھ حصہ قرون وسطیٰ کی اطالوی جمہوریتوں کو ملا۔ اُس میں مشرق کی اُن اقوام نو کی آزاد روایات بھی شامل تھیں جنہوں نے سلطنت روما کا اُس کے عہد انحطاط میں خاتمہ کر دیا تھا۔ لیکن چرچ نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی کیونکہ اُس کے ذہن میں مذہب کی منزل مقصود تو اگلے جہان میں ملے گی۔ لہذا عیسائیت نے اللہ کی بادشاہت کو اس دنیا میں قائم کرنے کے بجائے بخلاف تقاضا اسلام اکثر اُس حلقہ میں جسے وہ دنیوی قرار دیتی تھی غیر ذمہ دارانہ قوت کے نظریہ کی تائید و حمایت کی۔ سادونا کرولا کی طرح اُن لوگوں کو سزا دی جو زمین پر خدا کی بادشاہت کے قیام کو ایک

حقیقت سمجھتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے غیر ذمہ دارانہ
ہوسِ جاہ کے انسداد کے لئے عیسائیت نے جو سب
سے پُر فخر خدمت انجام دی ہے وہ "صلح ربانی" ہے
جس کی بدولت سال کے چند مخصوص دنوں میں جنگ کی
ممانعت تھی اور کون نہیں جانتا کہ عرب جاہلیت میں
بھی تو اس قسم کا ایک قاعدہ مروّج تھا۔ عیسائیت نے
دنیا کی دوسری بڑی خدمت یہ انجام دی کہ سود کی اُسی
شدّت سے ممانعت کی جس شدّت سے اسلام نے
اس کی حُرمت کا اعلان کیا ہے۔

از راہِ کرم میرا مفہوم سمجھنے میں غلطی نہ کیجئے۔ عیسائی
چرچ نے مصیبت میں امداد کے لئے اور یورپ کے
زخموں کے اندمال کے لئے بہت کچھ کیا۔ عیسائیت نے
بلاشبہ امن کا راگ الاپا۔ لیکن عوام کی زندگی سے بہت
دُور اُس نے راہبی ہی کو جنّت کا راستہ بنایا۔
اس طرح عیسائیت روز مرہ کی زندگی سے بہت دُور
بلکہ اُس سے نفور تھی اور اس کی یہ روش غیر ذمہ دارانہ
قوت کے نظریہ پر کوئی مؤثر روک ثابت نہ ہو سکی۔ اگرچہ

اعتراف کرنا پڑے گا کہ بعض درویش منش افراد نے ایسا کرنے کی کوشش ضرور کی۔ قرون وسطیٰ کا چرچ زمانہ سازی میں مبتلا رہا اور اس نے اکثر غیر ذمہ دارانہ نظریہ قوت کی تائید و حمایت میں اپنا زور صرف کیا۔ چرچ کا خاص معنوں میں ایک فرزند یعنی بارگوا نے جو پوپ الیگزنڈر ششم کا بیٹا تھا غیر ذمہ داری کا ایک نمونہ بن گیا۔ قیصر بارگوا اپنے زمانے کا سب سے بڑا سفاک تھا۔

میکاولی جو اپنی ریپبلک کی بدنظمیوں سے حد درجہ دل برداشتہ تھا بورگوا کے غارتگرانہ طریق کی کامیابی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے بے پناہ جور و ظلم ہی حکومت کا بہترین اور مؤثر ترین حربہ نظر آیا۔ بیسرے ہی حقیقت میں میکاولی کی شہرہ آفاق کتاب ' دی پرنس ' کا ہیرو ہے۔ یہ کتاب بعد میں جدید یورپ کی حکومتوں کے لئے ایک گونہ الہامی نظامنامہ بن گئی۔ مسٹر گلیڈسٹون آنجہانی جو اپنی جمہوریت پسندی اور مذہب پرستی کے لئے مشہور ہے میکاولی کے شہزادہ کو سیاسیات میں اسی طرح اپنا نمونہ سمجھتا تھا جس طرح

پرشیا کا فریڈرک ولیم یا کیتھرائن سمجھتی رہی ہے ۔ شہزادہ، حکومت ربانی کا کھلا ہوا انکار ہے کیونکہ یہ کتاب انسانی حکومت سے بالاتر کسی قوت کا اعتراف نہیں کرتی ۔

اس طرح عیسائیت کے پاس معاشرتی عمل و ارتباط کے سلسلہ میں کوئی معین نصب العین نہیں تھا کیونکہ عیسائی چرچ کا نصب العین حقیقی زندگی سے فی الحقیقت دور کا بھی واسطہ نہ رکھتا تھا ۔ عالم عیسائیت میں دولت اور جائیداد پر قبضہ اور اس کا نظم و نسق ان پابندیوں سے آزاد رہا ہے جو ایک عملی دینی حکومت ان پر عائد کرتی ہے ۔ ادنیٰ طبقہ عام طور پر امیروں کے امتیازات پر حسد کرتا اور بجائے ایک توازن قائم کرنے کے چاہتا ہے کہ اسے بھی وہی امتیازات حاصل ہوں ۔ اس طرح ان کا معاشرہ محروم توازن ہے اور فلسفی مزاج سیاستدان اپنے ضمیر کو بہلانے کی خاطر اسے مشین کے کسی اہم پرزے کے تزلزل سے تعبیر کرتا ہے لیکن حقیقت میں یہ تزلزل مشین کے کسی پرزے پر ہی نہیں بلکہ پوری مشین یعنی تمام معاشرہ پر مسلط ہو جاتا ہے یورپ کا وہ توازن قوت جس کا عہد وکٹوریہ میں اس قدر

شہرہ تھا اب کامل طور پر ختم ہو چکا ہے۔ آج وسطی یورپ
تباہ و برباد ہو چکا ہے کیا واقعات اور حالات میں کوئی
بات لائق تقلید ہے بالخصوص ایسے لوگوں کے لئے جو اپنے
ایسے ادارات رکھتے ہیں جو سیاسیات و عمرانیات پر پوری
طرح حاوی ہیں۔

گذشتہ جنگ عالمگیر (اوّل) کا سبق جو پوری قوت سے
ہم پر مسلّط کیا گیا یہ ہے کہ بعض مفکرین کی رائے کے مطابق
مغربی تہذیب اس راہ پر گامزن ہونے کی وجہ سے جو
ہلاکت آفرین ثابت ہو چکی ہے ایک صدی کے اندر اندر
نیست و نابود ہو جائے گی۔ یہ خطرہ یورپ میں متعدد لوگ
محسوس کر رہے ہیں جیسا کہ ان کوششوں سے جو اس
سے بچ نکلنے کے لئے کی جا رہی ہیں واضح ہوتا ہے۔ اقوام
عالم کے باہمی نزاعات کے تصفیہ کے لئے، ہیگ کا نونیشن
اور جمعیۃ الاقوام قائم ہوئی۔ سرمایہ و محنت کی کشمکش کی تلخی
کم کرنے کے لئے مزدوروں کی انجمنیں اور مصالحتی بورڈ مغربی
ممالک میں قائم ہو رہے ہیں۔ لیکن کسے معلوم نہیں کہ
لیگ آف نیشنز اور ہیگ کا نونیشن بڑے بڑے مجرموں کے

انسداد سے قاصر ہیں۔ اُن کی کوششیں اور اختیارات تو چھوٹے چھوٹے مجرموں کی سرکوبی کے لئے وقف ہیں۔ یقین جانیئے کہ نصب العین میں کامل تغیر کے بغیر کامیابی موہوم ہے جب تک دنیا ڈنڈے کی پرستش چھوڑ کر ایک اقتدار اعلیٰ اور ایک قوت بزتر کو تسلیم نہیں کر لیتی اُس کے لئے راحت و آسائش کبھی مقدر نہ ہو گی۔ ایک فرانسیسی مزاحیہ نگار نے کیا پتے کی بات کہی تھی "اگر خدا نہ ہوتا تو اُس کا گھڑ لینا لازم تھا" مغربی سیاستدانوں کو خدا کے وجود پر اعتقاد نہ ہو تو بھی اُن کو اپنے اعمال و اشغال میں اُس کے وجود کا اعتراف لازم ہے۔ اگر وہ یورپ کو اور دنیا کو ایک مسلسل خطرے سے نجات دلانا چاہتے ہیں تو انہیں مملکت الٰہیہ کے اصول یعنی انسان کے قانون سے ایک بالاتر اور بہتر قانون اور جزا و سزا کے تلخ تصور پر اعتقاد لانا لازم ہے۔

اسلام کی سیاسی و سماجی ساخت میں ایک اقتدار برتر موجود ہے جسے سب تسلیم کرتے ہیں ہر اسلامی ادارے اور شعار کی بنا وہ اصول و عقائد ہیں جن کے سامنے ہر مسلمان کا سر تسلیم خم ہے۔ اسلام نے انسان کی ہوس ترقی اور اُس کی

حیلہ سازیوں کو حدود اللہ کے اندر محدود کر دیا ہے اور یہ ایسی حدود ہیں جن کا احترام ہر مسلمان پر لازم ہے اور جن سے تجاوز کرنا اس کے نزدیک ایک کھلی ہوئی غلط کاری و گمراہی ہے یہی حدود اللہ حقیقت میں افراد و اقوام کے حقوق کے تحفظات ہیں۔ اسلامی مملکت میں غیر ذمہ دارانہ طاقت۔ غیر ذمہ دارانہ دولت۔ غیر ذمہ دارانہ حکومت و سیاست یا اسی قبیل کی کسی دوسری غیر ذمہ داری کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمان کی قوت و دولت حدود الٰہی کے تابع ہیں۔ مسلمان ان حدود کو تسلیم کرنا اور ان کے احترام پر مجبور ہے اس قوت و دولت کا جو مسلمان کو ودیعت کی گئی ہے محل استعمال شریعت حقہ نے معین و مقرر کر دیا ہے۔ کاروباری اور تجارتی معاملات میں بھی حدود مقرر کر دی گئی ہیں۔ معاہدات اور عہد و پیمان کا احترام لازم قرار دیا گیا ہے۔ فساد بازی اور ربا کو مسلمانوں پر حرام کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح نجی معاملات اور ذاتی کردار پر بھی حدود مقرر ہیں مثلاً منشیات کا استعمال ممنوع ہے عورتوں سے مساویانہ اور حسن سلوک کی ہدایت ہے۔ نوکروں سے انصاف اور غریب

رشتہ داروں سے فیاضانہ سلوک کا تقاضا ہے۔ وراثت کا ایک مستقل اور معین قاعدہ ہے۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ "وارثوں کے خلاف کوئی وصیت قابلِ قبول نہیں" محنت و سرمایہ اور آقا و خدمتگار کے تعلقات پر نہایت خوشگوار حدود قائم ہیں۔ حضور نبی کریمؐ کا ارشاد ہے " دولت جس کا برمحل یعنی شریعت حقّہ کے منشا کے مطابق استعمال کیا جائے۔ دنیا کے لئے باعثِ رحمت ہے اور ایک شخص کے لئے میلان ہے کہ وہ جائز طریقوں سے اپنی دولت بڑھائے " یعنی سوُد خوری اور دوسرے ظالمانہ اور غاصبانہ طریقوں سے دولت کمانے اور بڑھانے کی ممانعت ہے۔

امرا سے ٹیکس وصول کر کے غربا میں تقسیم کرنا چاہیئے۔

وہ مسلمان نہیں ہے جو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی فاقے سے ہو۔

مزدور کو اس کی اجرت اس کا پسینہ سوکھنے سے پہلے ادا کر دو۔

ضابطہ جنگ اور قومیت

اسلام کا اپنا ایک ضابطہ جنگ ہے جس کی رُو سے معاہدات کا احترام لازم ہے۔ دشمن کے سامان زیست کی بربادی کی ممانعت ہے۔ کشوری یعنی سول یا غیر حربی آبادی کے احترام کی تاکید ہے۔ ایسے دشمن کے لیے جو ہتھیار ڈال دے رحم کے سلوک کی تاکید ہے اور اسی قبیل کے دوسرے قواعد موجود ہیں جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ سیاسی ریاکاری کی ممانعت ہے اور مسلمانوں کی طرف سے جارحانہ کارروائیوں پر پابندیاں عائد ہیں۔ ارشاد قدسی ہے ا۔

وہ ہم میں سے نہیں ہے جو ظلم میں اپنے قبیلے کا ساتھ دیتا ہے۔ اور نہ ہی وہ ہم میں سے ہے جو ناانصافی میں دوسرے کو مدد کے لئے پکارتا ہے اور نہ ہی وہ ہم میں سے ہے جو اس حالت میں مرے کہ اپنے قبیلے کی ظلم میں امداد کر رہا ہو۔

یہی ممانعت تھی جس نے تمام اسلامی ممالک سے جارحانہ قومیت کے جذبے کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ آپ حضرت

کو بیرا اس وقت یہ راگ الاپنا جب عالم اسلام سے ترکی قومیت ۔ مصری قومیت ۔ شامی قومیت ۔ عراقی قومیت کے غلغلے بلند ہو رہے ہیں بے محل نظر آتا ہوگا ۔ لیکن اسلامی ممالک سے قومیت کی جو صدائیں آج بلند ہو رہی ہیں وہ تو یورپ کی استعمار پرستی کے خلاف دفاع کے شور و غوغا سے زیادہ کچھ نہیں ۔ اسلامی ممالک میں باہمی مخالفت سے اس قومیت کو دور کا واسطہ بھی نہیں ۔ بلکہ قومیت کے ان ہنگاموں میں اخوّت اسلامیہ کے لئے ایک نئی گرمجوشی پائی جاتی ہے ۔ آج پیکرِ اسلام میں ہر نسل و رنگ اور ہر قوم و قبیلے کے لئے ایک والہانہ جذبہ اخوّت ہی شاید ہماری واحد متاع بیش بہا ہے جسے ہم دوسروں کے روبرو اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ کہہ کر پیش کر سکتے ہیں ۔ آج جب کہ حدود کا پورا پورا احترام مفقود ہے اور حکومت الٰہیہ کے قلعے کی فصیلیں بعض مقامات سے شکستہ ضرور ہو چکی ہیں لیکن ہنوز قابلِ مرمت ہیں اخوّت اسلامیہ ہی ہماری وہ بیش بہا متاع ہے جس سے دنیا کا دامن خالی ہے ۔ انہی حدود کی بدولت تہذیب اسلامی اپنی سالمیت اور پوری

آب و تاب کے ساتھ بنی اُمیہ کے عروج و زوال، خلافت کا ایک قوم کے ہاتھ سے نکل کر دوسری قوم کے قبضے میں آ جانا اور چنگیز خاں کی ہلاکت باریوں جیسے انقلابات سے گزر کر ہم تک پہنچ گئی۔ تہذیب اسلامی کی سالمیت آج بھی قائم و بحال ہے۔ اس سلسلہ میں کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے۔ شریعت آج بھی دنیائے اسلام کا مقدس و محترم قانون ہے۔ ترک اپنی تمام اصلاحات میں قدم قدم پر اصلاحات کی مخالفت کے لئے بھی شریعت ہی کی پناہ ڈھونڈھتے ہیں۔ روس کے بالشویک مسلمان بھی یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ بالشویزم جیسی کچھ وہ اُن کے تجربے میں آئی ہے منافی شریعت نہیں آج ہر مسلمان یہ چاہتا ہے کہ شریعت اپنی اوّلین اور بنیادی صورت میں عصر حاضر کے حالات و مسائل پر منطبق کر دی جائے۔ مسلمانوں کا باہمی اختلاف مفہوم کی تفاصیل اور اُن طریقوں تک جو اس مقصد کے حصول کے لئے اختیار کرنے چاہئیں محدود ہے انہی حدود کی بدولت اگرچہ اُن پر بعض اوقات پورا پورا عمل نہ ہوا۔ عالم اسلام میں اس وقت لاکھوں عیسائیوں۔ یہودیوں۔ پارسیوں۔ ہندوؤں۔

بدھوں اور کاتھولکس کے نام لیواؤں کو صدیوں امان ملی جب یورپ غیر عیسائیوں کا نام و نشان مٹا دینا ایک فریضۂ مقدسہ سمجھتا تھا۔ یہی حدود تھیں جن کے احترام میں ترکوں سے جب وہ اپنے ملک کی مدافعت کے لئے گیلی پولی میں لڑ رہے تھے زہریلی گیس کے استعمال سے صاف انکار کرا دیا جو جرمنوں نے انہیں مہیا کی انہی حدود نے حد درجہ مطلق العنان بادشاہوں اور جابر حکومتوں کے ماتحت بھی اخوّت اسلامیہ کے عالمگیر جذبے کو زندہ رکھا۔ اور انہی حدود نے اسلامی سیاست کو اشتراکیت اور جمہوریت کے معائب سے محفوظ رکھتے ہوئے پوری قوم کے اندر اشتراکیت کے محاسن اور جمہوری ارتباط و اختلاط کی خوبیوں کو جاری و ساری رکھا۔

یہ نہایت تعجب و حیرت کا مقام ہے کہ ہم مسلمان اب تک مذہب کی طرف سے معیّن کئے گئے سیاسی ادارات پر یقین رکھتے ہیں اور ہمارا یہ اعتقاد محکم نہ ہوتا جاتا ہے اور اس خطرناک معاشری اور سیاسی ابتری اور بے ثباتی سے بچنے کے لیئے جو مغرب میں مادی خوش حالی کے ساتھ

جمع ہو گئی ہے انہی ادارت کو ہم ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ شاہ پسند۔ دستور پسند۔ اشتراکیین کمیونسٹ اور نراجی سبھی کو ایک ہی سلک قیاس میں منسلک کر لیا جائے تاکہ موجودہ تہذیب کو جو بلا شبہ متعدد اعتبارات سے بلند ترین تہذیب ہے اس تباہی و بربادی سے بچا لیا جائے جو اندر ہی اندر اُسے کھوکھلا کئے جا رہی ہے۔ جب تک شریعت کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے مسلمانوں کے لئے حکومت خواہ وہ ایک انتخاب کئے گئے جین حیات صدر کی صورت میں ہو۔ موروثی بادشاہت ہو۔ ملوکیت مطلقہ ہو یا مقیدہ۔ ری پبلک ہو حتیٰ کہ سوویٹ ریپبلک بھی ہو تو کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ شہزادہ سعد حلیم کی مجوزہ اسلامی ریاست کا خاکہ حسب ذیل ہے:۔

اسلامی ریاست

انتظام و انصرام۔ تعلیم۔ پالیسی اور عام معاملات میں اسلامی ریاست میں دینی و دنیوی کا امتیاز قطعاً مٹ جاتا ہے جن لوگوں کے ہاں بادشاہت صرف خداوند عالم

ہی کے لئے سزاوار ہے اُن کے لئے دُنیا دین سے کیونکر جدا ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کے نمائندے اُن علمأ باعمل میں سے جو وسیع بصیرت دینی کے ساتھ احکام دین کی عملی پابندی کے لئے مشہور ہیں مجلس قانون ساز کے ارکان منتخب کریں گے۔ الغرض مسلمانوں کا اوّلین فرض اُس جھوٹی مشیخت اور ملائیت باطل سے نجات پانا ہے جسے سعا حلیم دنیائے اسلام کی گمراہی و ضلالت کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب قرار دیتا ہے جب مملکت ابن اسلامی انداز پر منظم ہو جائے گی۔ اور اُسے اسلامی اخلاقیات۔ سیاسیات اور عمرانیات کے ماہرین کا مشورہ حاصل ہو سکے گا تو شریعت مطہرّہ کے بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسب ضرورت نئے قوانین وضع کرنا شروع کرے گی۔ شریعت کے بنیادی مسائل میں قانون کی نظر میں افراد اور مرد و عورت کی مساوات مرد اور عورت کے لئے حصول تعلیم کا عالمگیر اہتمام پوری پوری مذہبی رواداری وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

سوُد کی ممانعت ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ مسلمان کے لئے یہ قطعاً ناجائز اور حرام ہے کہ کسی شخص کی

مصیبت وتباہی کو اپنے لئے فائدے کا ذریعہ بنائے۔ لہٰذا ایک اسلامی ریاست میں ربوا اور ضروریات زندگی کی فروخت سے ناجائز نفع اندوزی کی ممانعت ہو گی۔ مشتبات کی خرید و فروخت اور جوا بازی کی قطعی ممانعت ہو گی۔ زکوٰۃ اور بیت المال کا جن کی بدولت قوم میں دولت کی منصفانہ تقسیم عمل میں آتی ہے قیام عمل میں آئیگا۔ شریعت مطہرہ کی حدود کے اندر حق املاک تسلیم کیا جائے گا اور اشخاص کے درمیان معاہدات کا احترام کیا جائے گا۔ شادی ایک سول معاہدہ سمجھی جائے گی جس میں طلاق اور نکاح ثانی کی آسانیاں میسر ہیں اور جس کی بدولت طلاق کسی رسوائی یا نارو‌ا تشہیر کا باعث نہیں ہوتی۔ اسلامی شادی زن ومرد کو شرافت کی حدود کے اندر اندر زیادہ سے زیادہ آزادی دیتی ہے اور دونوں کی رفاہیت و بہبودی کو ملحوظ رکھتی اور بچوں کی پرورش ونگہداشت کی ضامن ہوتی ہے۔ عورتوں کی محافظت کی خاطر مرد وزن اور عورتوں کے حد معقول سے بڑھے ہوئے اختلاط پر مناسب پابندی ہو گی۔ اسلامی قانون وراثت کو استوار

کیا جائے گا جو افراد کے پاس کثیر دولت کے جمع ہونے کو روکتا اور خاندان کی عورتوں تک کو ترکہ سے محروم نہیں رکھتا۔

اسلامی ریاست میں عورت کی ذات۔ اُس کے املاک اور حقوق کا احترام کیا جائے گا بچوں بالخصوص یتیموں کے حقوق کی نگہداشت کی جائے گی اور مملکت پر اُن کے حقوق تسلیم کئے جائیں گے۔ اسلامی سلطنت میں عالمگیر عسکری تربیت کا اہتمام کیا جائے گا اور یہ جبری بھرتی سے مختلف چیز ہے۔ جہاں تک خارجی پالیسی کا تعلق ہے معاہدات کو مقدس سمجھا جائے گا۔ جارحانہ قومیت و جنگ جوئی کی ممانعت ہو گی۔ اگر دوسری اقوام کی جارحانہ پالیسی کی وجہ سے اسلامی ریاست جنگ پر مجبور ہو جائے تو اسلام کے ضابطہ جنگ کی پوری پوری پابندی کی جائے گی۔ یعنی تمام وہ آبادی جو شامل جنگ نہ ہو مصؤن و مامون رہے گی۔ دشمن کے ذرائع معاش برباد نہیں کئے جائیں گے کسی ایسے تباہی خیز اور ہلاکت بار ہتھیار کا استعمال نہ کیا جائے گا جسے دشمن

مسلمانوں کے خلاف استعمال نہ کرے۔ شکست خوردہ دشمن
کے لئے عفو و کرم کا اعلان ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں اسی
خاکے کو عہد حاضر کی ایک مہذب ترین حکومت کا ترقی پسندانہ
پروگرام قرار دیا جا سکتا ہے۔

میں سعد حلیم کے خیالات میں اپنی دلچسپی کی وجہ سے
شاید اس مسئلہ کی تفصیل میں بہت دور نکل گیا ہوں۔
یہ تفاصیل آج ہمارے لئے ضروری نہیں ہیں۔ ہندوستان
میں اس وقت کسی اسلامی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے
کی مہم ہمیں درپیش نہیں سعد حلیم کو یہ مہم درپیش تھی۔
ہماری فوری ضرورت تو صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں
کی زوال آشنا قوم کو جو دوسری اقوام کے ساتھ یہاں
آباد ہے اور ایک ایسے طریق حکومت کے ماتحت زندگی
بسر کر رہی ہے جس میں اس کی نشاۃ ثانیہ کا کافی امکان
موجود ہے اصلاح حال کا راستہ بتایا جائے۔

یہاں ہمیں انتخاب صدر کے مسئلہ سے سروکار نہیں۔
نہ ہی ایوان عام یا ایوان علماء کے انتخاب کا مسئلہ
درپیش ہے۔ ہمارے پیش نظر تو اُن عظیم الشان قوانین

شریعت اور اُن مقامی ادارات کے احیاء کی ضرورت ہے
جو خلفائے راشدہ کے زمانے سے اسلامی ممالک میں
جوں کے توں چلے آرہے ہیں اگرچہ ہندوستان میں وہ
اپنی اصلی حالت میں برقرار نہیں رہ سکے۔ میں تو یہاں
تک عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ تاریخ ہند سے
میری سرسری واقفیت میرے دل میں یہ شبہ پیدا کرتی
ہے کہ آیا حقیقی اسلامی ادارات ہندوستان میں کبھی
قائم بھی ہوئے تھے۔ لیکن دوسرے ممالک میں اُن کے
نشانات سے اُن کے اصل کا آج بھی بہ آسانی سراغ
لگایا جا سکتا ہے۔

اشاعت تعلیم اور نوعیت تعلیم

آپ کے لئے مقدم ترین خدمت جہالت کی لعنت کو
دُور کرنا ہے کہ یہی مسلمانوں کی موجودہ ذلت و مسکنت کی
علت العلل ہے۔ اسلام اور جہالت اجتماع ضدین ہے
اسلام توہم پرستی یا مُلّائیت کا نام نہیں کہ جو زہریلے جراثیم
کی طرح اندھیرے اور گندے ماحول ہی میں پرورش پاسکتی

ہیں۔ اسلام صحت بخش ہوا اور بصیرت افروز روشنی کا مذہب ہے۔ یہ خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات کی صداقت کا مذہب ہے شجر اسلام کو اپنی بالیدگی اور بردمندی کے لئے علم اور روشنی کی ضرورت ہے لہذا ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر مسلمان مرد اور عورت کے لئے عہدِ حاضر کے علم اور عصرِ جدید کی روشنی کے حاصل کرنے کا اہتمام کریں۔ تعلیم بلا شبہ عالمگیر ہونی چاہیئے لیکن ساتھ ہی اسلامی بھی ہونی چاہیئے۔ ہمارا نظامِ تعلیم ایسا نہ ہونا چاہیئے جو عہدِ حاضر کی تمام عملی طور پر سود مند اور پر منفعت مادی معلومات کو دنیوی، قرار دے کر اُن سے یک قلم آزاد ہو جائے۔ بلکہ ہمارے نظامِ تعلیمی کے لئے لازم ہے کہ ہماری قدیمی علمی روایات کو زندہ کرے اور تمام علوم، کو مذہب ہی کا مرتبہ عطا کرے۔ ہمارے نظامِ تعلیم کے لئے لازم ہے کہ تمام علوم کے لئے اپنی مسجدوں میں گنجائش پیدا کرے۔ زمانہ حال کی سائنس میں تو کوئی چیز ایسی نہیں جس سے مسلمان خائف ہوں۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ موجودہ سائنس تو تہذیب اسلامی کے عہد شباب کے

علوم کا ایک نتیجہ بلکہ ایک تسلسل ہے۔ سائنس حقیقی تعلیمات اسلامی کا مخالف نہیں بلکہ خود اُن کا ایک جزو ہے ہمارے دیہات کی مساجد، ہمارے مکاتب اور شہروں میں ہماری مسجدیں ہی ہماری یونیورسٹیاں ہونی چاہئیں۔ آپ جدید ترین تعلیم کو شامل نصاب کیجئے پھر بھی وہ بیرون اسلام نہیں سمجھی جائے گی بشرطیکہ مسلمان خود اس فراموش شدہ حقیقت کو پالیں۔ قدیم دستور کے مطابق ہر شخص جو کسی مضمون میں بصیرت رکھتا ہے درس دے سکتا ہے اور ملک میں ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں جن پر اس سے بہتر کوئی صدقہ لازم نہیں آتا اس ملک میں اوّلین اسلامی فریضہ جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو دُور کرنا ہے جو ہمارے کثیر التعداد بھائیوں کے دماغوں کو کُند کر دیتا اور ملک و ملّت کے لئے کتنے ہی معائب و مصائب کا سبب بنتا ہے۔

جب انسانوں کے دل و دماغ نور تعلیم سے روشن ہوں گے تو اسلامی سائنس آرٹ اور ادب کی نشاۃ ثانیہ کے دَور کا آغاز ہو گا۔ مجھے اس کے متعلق جداگانہ طو

پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی کوئی جداگانہ اہمیت نہیں ؁

اخوّت

اس امر کو ہرگز فراموش نہ فرمائیے کہ مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں اور ہمارے مذہبی احکام یعنی وہ احکام جو قرآن کریم اور رسول اکرمؐ سے ہم تک پہنچے ہیں وہ نہیں جو آج کل کے بعض مدعیان اسلام پیش کرتے ہیں اخوّت اسلامیہ کے قیام و استحکام کے طالب ہیں۔ حالات خواہ کچھ ہی ہوں اور کوئی خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہے اخوّت سے متعلق احکام و ارشادات کو ایک بے معنی اور فرسودہ آئین سمجھنے کی گمراہی و ضلالت میں مبتلا مت ہوجیئے۔ اگر اخوّت اسلامیہ کا جذبہ مُردہ ہو چکا ہے تو پھر یہ احکام بھی بے معنی ہیں لیکن یہ تعلیم فرسودہ و زائد المیعاد یقیناً نہیں ہے کیونکہ بنی نوع انسان کی اخوّت کی ضرورت جیسی آج کل شدید ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ مسلمانوں میں پانچ وقت کی نماز۔ حج۔ روزہ قطع نظر اس قلبی و روحانی

فیض کے جو افراد کو اُن سے حاصل ہوتا ہے آج بھی ہمیشہ کی طرح دُنیا کے سامنے قوموں۔ زبانوں۔ ذاتوں اور جماعتوں کے اتحاد کے عظیم الشان اور عدیم المثال مظاہر ہیں۔

احیائے زکوٰۃ

اگر آپ مسلمانوں کے زوال کا انسداد اور اُن میں قوت و بالیدگی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کو قطعاً استوار کرنا چاہیئے اور ہر قریہ۔ شہر اور ضلع میں یہ کام نہایت ہی صاحب فراست اور دیندار لوگوں کے سپرد کرنا چاہیئے جو زکوٰۃ کو اُس کے محل یعنی بیکاری۔ گداگری اور عصیان و عدوان کے انسداد و دفعیہ کے لئے استعمال کریں اور قوم کے نادار بھائیوں کے دلوں میں ایک آزاد اور دیانتدارانہ زندگی کی لگن پیدا کر دیں۔

سُود

مسلمانوں کو ربوا کی پرچھائیں سے بھی اپنے تئیں بچانا

چاہیئے۔ میں اس امر سے خوب آگاہ ہوں کہ عہد حاضر کے
مالی اور تجارتی نظامات عہد گزشتہ کے نظامات سے مختلف
ہیں۔ قرآن کریم تجارت کو حلال اور سُود کو حرام قرار دیتا ہے
سُود ایک ضرورت مند بھائی کی بے بسی سے ناجائز فائدہ
اُٹھانے کا نام ہے اور تجارت ایک بھائی کو جس چیز کی
ضرورت ہے اس کا منصفانہ قیمت پر مہیا کرنا ہے۔ قرآن کریم
میں ربٰوا اور تجارت کا بلاشبہ یہی مفہوم ہے میری رائے
ناقص میں عہد حاضر کی بہت سی تجارت اصطلاح قرآنی
میں تجارت نہیں ربٰوا ہی کے ہم معنی ہے اور میں یہ بھی
جانتا ہوں کہ مسلمان مانتے ہیں کہ اکثر قسم کے سُود جن کا
آج کل رواج ہے ربٰوا نہیں ہیں کیونکہ اُن کے خیال میں
اُن سے کسی انسان کو مبتلائے اذیت نہیں ہونا پڑتا۔ ممکن
ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن انسانی برادری کے نقطۂ نظر سے غور
فرمائیے تو ایسے تمام معاملات حد درجہ ناپسندیدہ نظر آئینگے۔
ہمارے موجودہ نظام کا عام معاشری اثر بحیثیت مجموعی احساس
اخوّت کے لئے مہلک ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہر سوشلسٹ
پروگرام میں انسدادِ سُود کو بنیادی مقام حاصل ہوتا ہے۔

اس کا کیا سبب ہے کہ کمیونزم کو روس میں جب اقتدار نصیب ہوا تو کمیونسٹوں کا سب سے پہلا کام انسداد سود ہی نہیں بلکہ اس تمام نظام کا قلع قمع تھا جو سود پر مبنی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ نظام سرمایہ داری جس کی بنیادیں سود پر استوار کی گئی ہیں ایک صدی سے بھی کم عمر پانے پر آج یورپ میں ہر جگہ برلب گور ہے۔ مخالفین سود کے خیال میں سرمایہ داری سود پر مبنی ہونے کی وجہ سے ہی بہت سے سماجی معائب پیدا کرتی ہے۔ پس جذبہ اخوت و محبت کی پاسداری کی بنا پر مسلمانوں کے باہمی لین دین میں سود کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہ رکھیئے اگر اس لعنت سے ہمیں کوئی مفر نہیں تو اُسے مسلمانوں کے اُن قوموں سے لین دین تک محدود کر دیجئے جن کے ہاں سود ایک مستحکم ادارہ ہے۔ اور اُس صورت میں بھی اُسے عام کاروباری ضروریات تک ہی محدود رہنے دیجئے۔ اگر مسلمان کے لئے سود لینا حرام ہے تو دینا بھی حرام ہے۔ اس لئے انہیں دوسری اقوام سے قرض نہ لینا چاہیئے اور اصلی اسلامی نظام کو زندہ کرنا چاہیئے جو حقیقی ضرورت کے وقت اُن کی مدد کر سکے۔ یہی ادارہ

انہیں نمائش۔ فضول خرچی اور لایعنی مقاصد کے لئے قرض لینے سے باز رکھے اور اس طرح ہندی مسلمانوں کی معاشی پستی کے ایک سبب کا انسداد کر دے۔ قوم کی معاشی حالت سدھارنے اور اسلامی اخوّت کی نگہداشت کے لئے پُرانے مالی نظام اسلامی میں آپ کو سب کچھ مل جائے گا اور میں آپ کو مشورہ دونگا کہ اس مسئلہ کا پوری احتیاط اور کامل غور و خوض سے مطالعہ کریں۔ اگر ہم نے یورپی طریقوں کو اختیار کیا تو یہ دونوں مقاصد باہم دگر متصادم ہوں گے۔

منشیات اور قمار بازی کو اپنے تمام سماجی اور انفرادی اثر و رسوخ سے بند کر دیجئے۔ وراثت کے اسلامی قانون پر پوری شدّت سے عمل کیجئے۔ جہالت اور بے علمی کے خلاف ایک باقاعدہ جنگ جاری کر دیجئے اور اپنے اسلامی فرائض کی انجام دہی میں لگ جائیے۔ زکوٰۃ کی باقاعدہ ادائیگی شروع کیجئے بیت المال کا قیام عمل میں لائیے۔ ان تمام احکام شریعت کی پوری پوری متابعت کیجئے تو آپ جلد موجودہ پراگندہ اور پریشان حال بھیڑ کی جگہ مسلمانوں کو ایک ترقی یافتہ۔ منظم اور فارغ البال قوم ہی بدل دیں گے۔

تقدیر پرستی۔ جہاد۔ تنظیم اور طریقِ انتخاب

میں نے آپ سے عرض کیا ہے کہ اسلام کے خلاف تقدیر پرستی کا الزام قطعاً بے بنیاد ہے۔ اسلام کے خلاف تو بلاشبہ یہ الزام حد درجہ غیر منصفانہ ہے لیکن خود مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کے خلاف تو یہ الزام یقیناً نامنصفانہ نہیں ہے۔ ایسے جاہل مسلمانوں میں جو تعلیمات اسلامی سے بے بہرہ ہیں ایک احمقانہ اور کورانہ تقدیر پرستی پائی جاتی ہے۔ اُن کی یہ تقدیر پرستی جہاد کے غلط مفہوم پر مبنی ہے جسے کافروں کے خلاف جنگ آزمائی میں ہی محدود کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ کافروں کے خلاف محض اُن کے کفر کی وجہ سے ہی جنگ کا تو کہیں حکم نہیں۔ البتہ مسلمانوں کو بدی کے خلاف۔ جارحانہ باطل کے خلاف۔ کاہلی کے خلاف غفلت و تن آسانی کے خلاف۔ حقوق کی محافظت میں۔ گندگی اور جہالت کے خلاف مسلمان کو ہر مقام اور زندگی کے ہر شعبہ میں یہاں تک کہ اُس کے گھر کے اندر اور خود اُس کے نفس کے خلاف بھی جنگ کا حکم ضرور دیا گیا ہے۔

ایک سچے مسلمان کی زندگی ہی تمامتر جہاد سے عبارت ہے اور جب اُس کی زندگی جذبہ جہاد سے رفعت و نور حاصل کر لیتی ہے تو اُسے بلاشبہ اس حد تک تقدیر پرستی کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ اس امر کے اطمینان کے ساتھ کہ وہ ہمیشہ اپنی بساط کے مطابق اپنا فرض بجا لا رہا ہے۔ اُسے اس بات کی پرواہ نہیں رہتی کہ اُسے کیا پیش آ رہا ہے۔ اُسے اللہ کے وعدے پر اعتبار ہے۔ ولا خوف علیہم ولا ھم یحزنون۔

اگر اسلام کو دنیائے جدید کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں جذبۂ جہاد کو زندہ کر دکھائیں۔ اُن پر لازم آتا ہے کہ وہ حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت میں مسلسل نبرد آزما رہیں اور اس طرح دنیا میں اُس شرف و افتخار کو اپنے لئے دوبارہ حاصل کریں جو کبھی اُن کے آباؤ اجداد کا حصہ تھا۔ دوسری قوموں میں اسلام اور اسلامی ادارات صرف اُسی صورت میں قبولیت حاصل کر سکتے ہیں جب خود ہمارا عمل اُن کے نزدیک اسلامی اور پسندیدہ ہو۔ ہم دوسری قوموں کے

ادارات اور شعائر کو اپنے ادارات اور شعائر کی جگہ اختیار نہیں کر سکتے" اگرچہ یہ ممکن ہے کہ پورے غور و خوض کے بعد ہم اپنے ادارات کے ساتھ ساتھ دوسری قوموں کے بعض مفید ادارات اپنا لیں۔ مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان منظم ہو جانا چاہیئے ورنہ وہ اپنی کامل حکومت الٰہیہ کی قوّت سے جو عہد حاضر کے لئے اُن کا سب سے گراں قدر تحفہ ہے محروم ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اُن کی تنظیم اور اُن کے ادارات کو پوری قوت و کارگذاری کے ساتھ قائم کرنے کے راستے میں کوئی روک نہیں ہے۔

جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کی تنظیم کا تعلق ہے اُن کے دانشوروں کی ایک کونسل قائم ہونی چاہیئے جو اُن معاملات کی انجام دہی اور سربراہی کی ذمہ دار ہو جن کا تعلق تمام ملّت اسلامیہ ہندیہ سے ہو مثلاً مسلمانوں کی تعلیم اور اصلاح و احیاء کی مقامی کوششوں میں ربط پیدا کرنے کے لئے ہر گروہ اور ضلع کو اسلامی طرز پہ اپنا ایک جداگانہ نظام قائم کرنا چاہیئے۔ یہاں ہمیں پھر اسلامی مملکت کے نظام کی طرف رجوع کرنا پڑے گا لیکن اُس کے

بالائی حصّوں کی طرف نہیں جن کی تعمیر کی کوشش سعد حلیم نے
کی بلکہ اُس کے نچلے اور بطنی حصّے کی طرف۔ اسلامی ریاست
میں حلقۂ انتخاب محدود ہوتا ہے تاکہ لوگ اُن نمائندوں میں
سے جو اُن کو اپنے آپ میں سے منتخب کرتے ہیں اچھی
طرح واقف ہوں اور یہ حلقۂ انتخاب اُن لوگوں پر مشتمل
ہوتا ہے جن کی آراء و مفادات میں تضاد نہیں توافق ہوتا
ہے "تاکہ نمائندہ بڑی حد تک اُن کی نمائندگی کا اہل ثابت
ہو۔ شاید آپ کہیں گے کہ اس صورت میں تو ہمیں
پارلیمنٹ کے لئے ارکان کی بہت بڑی تعداد درکار ہوگی۔
میں ممبران پارلیمنٹ کا نہیں بلکہ ادنےٰ ترین نمائندہ ادارہ یا
ایوان کا ذکر کر رہا ہوں یعنی گاؤں کی پنچایت اور شہر میں
کسی پیشہ یا تجارت کی کوئی مجلس یا ایسوسی ایشن۔ ادنیٰ
ترین نمائندہ مجالس میں سے ہر ایک اپنے ارکان میں سے
ایک رکن کا انتخاب کرتی ہے اور اس طرح پر منتخب کئے
ہوئے نمائندے شہر کی کونسل یا ضلع کی کونسل کے ارکان
بن جاتے ہیں اور اسی طرح ضلع کی کونسلیں صوبائی کونسل
کے لئے اپنا اپنا نمائندہ منتخب کرتی ہیں اور صوبائی کونسلوں

کے نمائندے اسی طرح ایوان عام یا کونسل آف سٹیٹ
کے لئے نمائندے منتخب کرتے ہیں۔

یہ طریق انتخاب پارلیمانی طریق انتخاب سے بلاشبہ مختلف
ہے لیکن اس کے فوائد واضح اور کثیر ہیں مثلاً ہر صورت
میں ہر حلقہ انتخاب پورے پورے طور پہ اس فرض کی
انجام دہی کا کاملاً اہل ہے۔ اعلیٰ ایوانات کے لئے
جن لوگوں کو انتخاب کیا جاتا ہے وہ ایسے ہوتے ہیں تجربے
کے علاوہ جن کی انتخاب کے لئے اہلیت مسلّم ہو چکی ہوتی
ہے۔ حکومت خود اختیاری کا یہی قدیم نظام ہے۔ مثلاً
نظام شیوخ جو اسلام کی تصدیق و تقدیس سے بہرہ ور
ہو چکا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ نظام مشرق
میں جہاں کہیں معقول آزادی کے ساتھ زیر عمل آیا ہے
ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔ اس نظام کی سب سے بڑی
خوبی یہ ہے کہ اس کی بدولت حقیقی خوبیوں کے ایسے
لوگ جنہوں نے زندگی بھر عوام کی خدمت کی ہو ان
ایوانوں تک پہنچ سکتے ہیں میں آپ لوگوں سے پُر زور
سفارش کرتا ہوں کہ اپنی قومی تنظیمات یا ادارات میں اسی

طریقِ انتخاب پر عمل پیرا ہوں۔

عسکر المسلمات

میں نے ہندوستان میں مسلمان عورت کی حیثیت سے اپنی رائے بلا کم و کاست اور بلا خوف عرض کر دی ہے۔ مسلمان عورت کی حیثیت ہمارے ہاں حد درجہ قابل اصلاح ہے اور اس اصلاح کی ضرورت نہایت شدید ہے۔ ارشاد نبویؐ کے ماتحت انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کیجئے اور انہیں وہ مواقع مہیا کیجئے جو اُن کی فطری خوبیوں اور صلاحیتوں کے نشو و نما کے لئے ضروری ہیں۔ اپنے قوائے فطری کی کامل نشو و نما کے لئے اُن کا حق اسی طرح مسلّم و مقدّس ہے جس طرح مردوں کا حق اور جو شخص عورتوں کو اُن کے اس حق سے محروم رکھنا چاہتا ہے بڑا ہی ظالم ہے۔

اسلامی اور غیر اسلامی ادارات

مسلمان غیر مسلموں کے آئین و ادارات اختیار نہیں کر

سکتے لیکن دوسری قوموں کے ادارات اور رسوم و شعائر کا احترام اور غیر مسلموں کے ساتھ ہمسایوں کی سی روا داری و خیر سگالی سے زندگی بسر کرنا اُن پر لازم ہے۔ مذہب اسلام عدم روا داری اور جنون مذہبی سے سرتا سر بیگانہ ہے۔ قرآن کریم اور رسول اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ عدم روا داری مذہبی تعصب اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے خلاف ادنٰی ترین بے تمیزی کی ممانعت کرتا ہے۔ اُن لوگوں میں جو حلقہ بگوشانِ اسلام ہونے پر فخر کرتے ہوں مذہبی تعصب اسلام سے ناواقفیت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے ہندوستان میں مسلمانوں کی عدم روا داری اُن کی مذہب سے انتہائی بیگانگی کی دلیل ہے ہم چاہتے ہیں کہ مسلمانوں وجود تمام اہلِ ہند کے لئے موجب زحمت نہیں وجہ رحمت ثابت ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بھی اشاعت کی اشد ضرورت ہے۔ مذہبی تعصب کی ندامت و برباد جیسی میں نے تھوڑا عرصہ گذرا اُس شخص کے قتل سے جس کا مجھے احترام منظور تھا محسوس کی تھی دہی عام پہ ضرور محسوس کی گئی ہو گی۔ اسلام میں کسی شخص سے

اختلاف آراء کی یا لوگوں کو ہم خیال بنانے کی بنا پر نفرت کا کوئی جواز۔ خدا نہ کرے مجھے یہ کہنے کی ضرورت پیش آئے کہ اسلام کسی شخص کے قتل کو جائز نہیں رکھتا۔ اسلام انسانوں میں انصاف کامل کی دعوت ہے۔ ایماندارانہ اختلاف رائے کا احترام سکھاتا ہے۔ تمام نیک لوگوں کی خواہ وہ کوئی ہوں عزت کا سبق دیتا ہے اسلام غیر مسلم دنیا کا دشمن نہیں اُس کا حامی و غمخوار ہے۔ البتہ وہ حق و باطل کی آویزش میں جب کبھی اور جہاں کہیں وہ پائی جائے حق کا ساتھ دینے کی تلقین کرتا ہے۔ میں آپ لوگوں سے پُر زور اپیل کرونگا کہ اسلامی رواداری کی خوبی پر عمل کیجئے اور اس کی اشاعت کیجئے۔ مسلمان کو تو غیر مسلم کا جام شراب بھی اُلٹ دینے کی ممانعت ہے۔ ہمیں دوسروں کے مذہب کے خلاف ایسے الفاظ زبان سے نکالنے کی ممانعت ہے جس سے اُن کے احساسات مجروح ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی رواداری دُنیا کے لئے اُن کی بزرگداشت کا عظیم الشان تاریخی حق ہے اور مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ رواداری ہی

انسانیت کے جسم کے رستے ہوئے ناسور کے اندمال کا علاج ثابت ہو گی۔ اس دوا داری کو دوبارہ عملاً زندہ و قائم کر دکھائیے۔ اس اعتبار سے بھی مسلمانوں میں ضبط و تنظیم کی ضرورت ہے۔

آج کتنے ہی اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے ٹھیک اُسی طرح یہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں جس طرح اُن سے پہلے یہودی اور عیسائی کہتے تھے کہ بہشت صرف اُن کی قوم کے لئے وقف ہو چکا اور دوسروں پہ اُس کی پرچھائیں تک حرام ہے۔

ان الذین آمنوا والذین هادوا والنصاری والصابئین من آمن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ یہ تحقیق بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور عیسائی اور بیدین جو کوئی ایمان لائے ساتھ اللہ کے اور دن پچھلے کے اور کام کرے اچھے اُن کا حق الخدمت بھی ہے اُن کے پروردگار کے پاس اور ان (جا کر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں اُن پہ اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

وقالوا لن یدخل الجنۃ الا من کان هودا او نصاری تلک امانیھم قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ بلی من اسلم وجھہ للہ وھو محسن فلہ اجرہ عند ربہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ اور یہود اور نصاری یوں کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پاویگا بجز اُن لوگوں کے جو یہودی ہوں یا اُن لوگوں کے جو نصرانی ہوں یہ (خالی) دل بہلانے کی باتیں ہیں آپ کہیے کہ (اچھا) اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو ضرور دوسرے لوگ جاویں گے جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالے کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اُس کا عوض ملتا ہے اس کے پروردگار کے پاس پہنچ کر اور نہ ایسے لوگوں پر (قیامت میں) کوئی اندیشہ ہے اور نہ ایسے لوگ اس روز مغموم ہونے والے ہیں۔

تہذیبِ اسلامی

یعنی

محمد مارمیڈیوک پکتھال کے

خطباتِ مدراس کا اردو ترجمہ

مترجمہ

شیخ عطاء اللہ ایم۔ اے

پرنسپل

اسلامیہ کالج چنیوٹ

ناشر

شیخ محمد اشرف۔ تاجر کتب کشمیری بازار

لاہور